سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام السیرۃ النبی ﷺ عام طور سے مشہور ہی مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصّے شائع ہو چکے ہین، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہی جسمیں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہی، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہی تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہی، اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہی جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہی، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہی جو آپکے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہی کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہی، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہی،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اوّل تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلان ہے، تقطیع خورد صہ و ہے، حصہ سوم تقطیع کلان ہے، للعہ، تقطیع خورد معہ و صہ، حصہ چہارم تقطیع کلان ہے، روپے، تقطیع خورد معہ و صہ، حصہ پنجم تقطیع کلان صہ، للعہ

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈہ)

جلد ۴۱	ماہ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۳۸ء	عدد ۵

مضامین

شذرات

ماتم اقبال

وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیائے فانی کو الوداع کہا، صفر کی بیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت، اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی، ایسا عارف فلسفی، عاشقِ رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان، اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے دہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اسکی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پرواز بالِ جبریل تھا، اُسکی فانی عمر گو ختم ہوگئی، لیکن اسکی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بنکر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غمخوار شاعر اب عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے، خداوندا! اس کے دلِ شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غمخواری فرما! اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزیں کو مسرور کر،

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کیلئے ایک نیا پیام لاتا تھا، وہ توحید خالص کا پرستار، دینِ کامل کا علمبردار، اور تجدید ملت کا طلبگار تھا، اسکے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا اور اسکی آنکھیں جسمِ اسلام کے ہر ناسور پر اشکبار رہتی تھیں، اس نے مستقبلِ اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا، اسی خواب

کی تعبیر میں اسکی ساری عمر ختم ہوگئی، ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

کہنے کو تو ہم میں ملت کے غمخوار ون کی کمی نہیں، اور نہ امت کے دوستداروں کی قلت، مگر واقعہ یہ ہے کہ نئی تعلیم نے اپنے ساٹھ ستر برس کے طویل عرصہ میں دو ہی سچے مسلمان غمخوار پیدا کئے، ایک محمد علی مرحوم اور دوسرا اقبال مرحوم، دونوں مرحوموں پر خدا کی بڑی رحمت ہو، ان کے دلوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا، اور رسول رحمت صلعم کے ساتھ سچا عشق، نئے زمانہ کی جھوٹی آب و تاب، اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں، آفتابِ اسلام کی ضیا باری کے مقابلہ میں اُن کے سامنے جدید تہذیب و تمدن، اور زمانۂ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی مہِ نخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی، خدا ان کی قبروں کو اپنے نور سے بھر دے،

اقبال کی قومی شاعری بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوئی، بیسویں صدی کے اس پیغام رساں نے اپنے اڑتیس برس کے شاعرانہ پیغاموں سے ملت کے نوجوانوں میں نئی امنگ بھر دی اور نئے سفر کے قطعِ منزل کے لئے ان میں نئے سرے سے ہمت پیدا کر دی، اقبال کا یہ دعویٰ حرف حرف سچا تھا،

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یاد رہینگی، وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بنکر انشاء اللہ رہیگا، ان کی شرحیں لکھی جائینگی، تشریحیں کیجائینگی، نظریئے ان سے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا، اسکی دلیلیں ڈھونڈھی

جائیں گی، قرآنِ پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے اُن کا مقابلہ ہوگا، اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں انشاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا، اور اقبال کی زندۂ جاوید!،

اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں، یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرارِ کلامِ الٰہی کے محرم اور رموزِ شریعت کے آشنا تھے، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا، یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا،

دفد کا بل جن تین ممبروں سے بنا تھا، افسوس ہے کہ اس میں یکے بادیگرے دو چل دیئے، سر راس مسعود اور اقبال، اب صرف ایک رہ گیا ہے، اور معلوم نہیں کہ وہ بھی کتنے دن کے لئے ہے، آہ

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند

مولنا شبلی مرحوم نے اقبال کو اسی وقت پہچان لیا تھا جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغِ شہرت نے بال و پر نہیں پیدا کئے تھے، چنانچہ انھوں نے پیشگوئی کی تھی کہ حالی و آزاد کی جو کرسیاں خالی ہونگی، ان میں سے ایک اقبال کی نشست سے پُر ہو جائیگی، افسوس کہ آج اٹھتیس برس کے بعد وہ کرسی خالی ہوگئی اور اب اسکے بھرنے کی کوئی صورت نہیں،

اقبال: ہندوستان کا فخر اقبال! اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال! فضل و کمال کا پیکر اقبال! حکمت و معرفت کا دانا اقبال! کاروانِ ملت کا رہنما اقبال! بر خصت رخصت! الوداع الوداع سلام اللہ علیک و رحمتہ الیٰ یوم التلاق!

مقالات

اسلامی نظامِ تعلیم

از مولینا ریاست علی ندوی

اساتذہ کے فرائض

اسلامی مدارس کے معلموں کے فرائض چند نوعیتوں کے تھے، ایک خود ان کی سیرت و کردار پر چند قیود عائد تھے، دوسرے اساتذہ اور طلبہ کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں ان کے ذمہ چند واجبات تھے، پھر اُن کے حلقۂ درس میں ان کے بعض معمولات مقرر تھے، ان میں سے دونوں اوّل الذکر کا اجمالی بیان ذیل میں پیش ہے، اور آخر الذکر کی تفصیل حلقۂ درس کے بیان میں آئے گی،

اساتذہ کی ذاتی سیرت و اوصاف

اسلامی دورِ تعلیم میں استادوں اور لڑکوں کے تعلقات روحانی باپ اور بیٹوں کے طور پر قائم تھے، اساتذہ لڑکوں کے صرف تعلیمی مشاغل کے ذمہ دار نہ تھے، بلکہ ان میں رُوحانی پاکیزگی اور بلند اخلاق پیدا کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا، اس لئے جس طرح ایک گھر میں باپ اپنے بچوں کی آیندہ زندگی کیلئے نمونہ ہوتا ہے، اسی طرح اساتذہ کی زندگی طلبہ کے لئے اسوۂ عمل تھی، اس لئے ضروری تھا کہ اساتذہ بھی ذاتی طور پر کامل دیندار اور محاسنِ اخلاق اور تہذیب و شائستگی کے سراپا پیکر ہوں، اس لئے اسلام کے تعلیمی دستور العمل میں شاگردوں کو ان کے تعلیمی فرائض کے ساتھ تربیت اور تہذیبِ نفس کے اصول بتائے گئے ہیں، اسی طرح استادوں کی دینداری، تہذیبِ اخلاق، اور طرزِ زندگی پر نگاہ رکھی گئی ہے، چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے اپنی کتاب میں استادوں کے آداب میں جو باب باندھا ہے، اس میں انھی

اصولوں کی تشریح کی ہے، تقریباً انہی اصولوں کے مانند امام غزالی نے بھی احیاء العلوم جلد ا کتاب العلم میں اساتذہ کے اوصاف اجمال کے ساتھ بیان کئے ہیں، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:-

استادوں کے لئے ذیل کے چند ذاتی اوصاف ضروری ہیں:-

خوفِ خدا علماء اور اساتذہ پر واجب ہے، کہ وہ بزم و خلوت ہر جگہ اپنے تمام اقوال و افعال اور حرکات و سکنات میں خوفِ خداوندی ملحوظ رکھیں، کیونکہ جو علوم انھیں ودیعت کئے گئے ہیں، ان کے حقیقی نگہبان اور امانت دار وہی ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

لَا تَخُونُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ وَ تَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ، (انفال - ع ۳)

اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو، اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو، تم (خیانت کے وبال سے) واقف ہو،

ایک دوسری جگہ فرمایا:-

بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللّٰهِ وَ كَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ، (مائدہ - ع ۵)

کیونکہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے، اور وہ اس کی حفاظت کرتے بھی رہے، لوگوں سے نہ ڈرو ہم سے ڈرو،

وقار و متانت علماء کی زندگی متانت اور وقار کی ہونی چاہئے، امام شافعی فرماتے ہیں:-

"علم صرف یہ نہیں ہے کہ علم کی چیزیں رٹ لیجائیں، علم کے لئے متانت، وقار، خشوع و خضوع اور خاکساری پر عمل کرنا اور قائم رہنا ضروری ہے"[1]

قتیبہ امام مالک کے درس کی مجلس کے متعلق کہتے ہیں:-

"امام مالک کی مجلس وقار، حلم، اور علم کی مجلس تھی، وہ پر وقار اور اچھی خصلتوں والے تھے، ان

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۵، ۱۶،

کی مجلس میں شور اور ہنگامہ نہ تھا، اور نہ آواز بلند ہوتی تھی"[1]

امام مالک خلیفہ ہارون رشید کے نام ایک نصیحت نامہ میں فرماتے ہیں:

"جب تم علم حاصل کرو، تو علم کی نشانیاں، متانت، وقار اور حلم بھی اپنے اندر پیدا کرو، کیونکہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے، کہ علماء رسولوں کے وارث ہوتے ہیں"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:-

"علم حاصل کرو اور اس کے لئے متانت اور وقار پیدا کرو"[2]

شریعت کی پابندی شریعت کی پابندی کرنا معلموں اور عالموں کا سب سے پہلا فرض ہے، وہ اسلامی شعائر اور ظاہری احکام کے پورے پابند ہوں، خاص طور پر مسجدوں میں نماز با جماعت پابندی سے پڑھتے ہوں، ہر خاص و عام کو سلام کرنے میں پیش دستی کرتے ہوں، مصیبت کے وقت صبر کرتے ہوں، سنتوں پر عمل کرتے ہوں، بدعتوں سے دور رہتے ہوں، مسلمانوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہوں اور برائی سے بچاتے ہوں، اور مسلمانوں کی قومی اور ملی مصلحتوں کی مذہبی طریق پر پاسداری کرتے ہوں کیونکہ علماء اور اساتذہ ہی عام مسلمانوں اور طالب علموں کے پیشوا ہیں، اگر ایک عالم اپنے علم سے خود فائدہ نہ اٹھائے، تو دوسرے اس سے کیونکر فائدہ اٹھائیں گے، اسلئے عالم کی گمراہی کا جرم زیادہ سنگین اور پر معصیت ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ سے برائیوں کے پھیلنے کا زیادہ امکان ہے، عوام اسکی معصیت سے جری ہو کر زیادہ جرأت کیساتھ علانیہ گناہوں کے مرتکب ہوں گے،

اسی طرح علماء کا فرض ہے کہ وہ کلام پاک کی تلاوت پابندی سے کریں، اور دل کو بیدار رکھ کر اللہ تعالےٰ کے ذکر میں مشغول رہیں، اور تلاوتِ قرآن میں اس کے معنوں اور مطلبوں، اس کے حکموں اور ممانعتوں، اور اس کے وعدوں اور دھمکیوں پر غور و فکر کرتے رہیں،

اخلاق حسنہ اختیار کرنا اس کے ساتھ انھیں محاسنِ اخلاق کے زیور سے آراستہ ہونا چاہئے، ان کی سراپا زندگی

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ا صفحہ ۱۹۷، [2] تذکرۃ السامع ص ۱۶ - یہ اثر کنز العمال ج ۵ ص ۲۰۲ میں موجود ہے،

پاکبازی اور قناعت میں بسر ہو، خیرات و صدقات کریں، لوگوں کو کھانا کھلائیں، لوگوں سے کشادہ پیشانی سے پیش آئیں، غصہ کو پی جائیں، دوسروں کی مصیبتوں میں ہمدردی کریں، اور ان کے دور کرنے کی کوشش کریں، اپنے اثر و اقتدار کو لوگوں کے فائدہ پہونچانے اور ان کی جائز سفارشیں کرنے میں صرف کریں، فقیروں کیساتھ لطف اور نرمی سے پیش آئیں، پردیسیوں اور رشتہ داروں سے محبت کریں، طالب علموں سے نرمی کا سلوک کریں، ان کی ہر قسم کی دستگیری کریں، اگر کسی کو دیکھیں کہ وہ نماز کا پابند نہیں، طہارت کا لحاظ نہیں کرتا یا دوسرے واجبوں کو علانیہ ترک کرتا ہے، تو اسے تلطف اور نرمی سے سمجھائیں، جیسے کہ رسول اللہ صلعم نے اس اعرابی کو جس نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا تھا، نرمی سے سمجھایا تھا، مجموعی طور پر اچھے اخلاق اور عمدہ عادتیں تو استغفار، اخلاص و یقین، صبر و تقوی، قناعت و رضا، زہد، توکل، صفائی باطن، حسن ظن، تجاوز و درگذر، حسن خلق احسان، شکر نعمت، مخلوق پر شفقت، شرم و حیاء، اور محبت الٰہی ایسے جامع خصائل ہیں جنھیں پیدا کرنا چاہئے اور جو صرف حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و اتباع ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں، اِن کُنتُم تُحِبُّونَ اللہ فَاتَّبِعُونی یُحبِبکُمُ اللہ وَیَغفِر لَکُم ذُنُوبَکُم، (آل عمران ع ۴)

اخلاق رذیلہ سے اجتناب

دوسری طرف انھیں ہر قسم کے بُرے اخلاق سے اپنا دامن پاک اور صاف رکھنا چاہئے، خصوصاً بغض، حسد، کینہ، تکبر، بخل، خباثت نفس، خود پسندی، فخر، غیبت، چغلخوری، جھوٹ، بہتان، حرص، طمع، مداہنت، نمود و نمایش، فحاشی، ہزل گوئی، ٹھٹھا، بیہودہ مذاق اور دنیا طلبی یہ ایسے برے اخلاق ہیں جن سے علماء کو بلند اور برتر رہنا چاہئے، اس کے بعد قاضی ابن الجماعہ فرماتے ہیں،

"بہت سے علمائے زمانہ الا ماشاء اللہ ان عیبوں خصوصاً حسد، تکبر، ریاکاری، اور دوسرے لوگوں کو حقیر اور کمتر جاننے میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان بلاؤں کی دوائیں زہد اور اخلاق کی کتابوں میں موجود ہیں، جو شخص اپنے آپ کو ان عیبوں سے پاک کرنا چاہے، وہ ان کتابوں کی طرف رجوع کرے، ان میں سب سے مفید محاسبی رحمہ اللہ تعالیٰ (متوفی ۲۴۳ھ) کی کتاب الرعایۃ ہے[1]"

[1] تذکرة السامع ص ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۲۴، کتاب الرعایۃ،

احترام علم

اساتذہ اور علماء کا فرض ہے، کہ وہ خود بھی علم کی عزت کریں، اور اپنے کسی طرز عمل سے کوئی ایسا موقع نہ آنے دیں، کہ علم کے احترام کو صدمہ پہونچے، امام اعظم ابو حنیفہ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا:-

"اپنے عماموں کی عظمت کرو، اور اپنی آستینوں کو وسیع کرو"[1]

امام زہری فرماتے ہیں:-

"علم کے لئے یہ بھی کسر شان ہے کہ اسے اس کے حاصل کرنے والے کے گھر پہونچایا جائے، عام اس سے کہ وہ دنیاوی وجاہت اور مرتبہ میں وہ جس قدر بھی بلند درجہ ہو"[2]

البتہ اگر کوئی خاص مجبوری ہو یا کسی دینی مصلحت کا تقاضا ہو تو تعلیم دینے کیلئے استاذ متعلم کے گھر پر جاسکتا ہے، چنانچہ مختلف ائمۂ سلف سلاطین اور امراء کے لڑکوں کو پڑھانے کے لئے ان کے محلوں میں تشریف لے گئے، خود امام زہری خلیفہ ہشام کے لڑکوں کو پڑھانے کے لئے قصر خلافت میں تشریف لیجاتے تھے، امام شافعی مصر کے جلیل القدر خانوادہ بنو عبد الحکم کے یہاں مقیم تھے، اور ان دونوں بزرگوں کے متعلق یہ تصریح ہے معلوم ہے کہ انھوں نے ان لوگوں سے مالی مدد قبول فرمائی، ہشام نے امام زہری کے سات ہزار دینار کا قرض اتارا اور بنو عبد الحکم نے بعض موقعوں پر ۳ ہزار دینار سے امام شافعی کی مدد کی،

لیکن ان ائمہ کو دینی حیثیت سے جو مرتبہ حاصل تھا، اور ان کی پوری زندگی، دین کی خدمت میں جس اخلاص و حُسن نیت سے صرف ہوئی، اسے دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا چاہئے، کہ ان لوگوں کا علم سکھانے کے لئے درباروں میں جانا کسی دنیاوی غرض سے نہ تھا، ورنہ دنیاوی اغراض، جاہ و منزلت، عزت و شہرت، نام و نمود اور ہمسروں سے سبقت اور فضیلت حاصل کرنے کی خواہش اسلامی دستور تعلیم کے رو سے بدترین اخلاقی گناہ ہے[3]

امام شافعی فرماتے ہیں:-

"میں چاہتا ہوں کہ مخلوق، علم کا ایک حرف بھی میری طرف منسوب کئے بغیر اس علم کو مجھ سے

[1] تعلیم المتعلم ص ۱۰ [2] تذکرة السامع ص ۱۶، ۱۷، و تذکرة الحفاظ جلد ۱ ص ۱۰۳ و مقدمہ سیرة عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم ص ۱۴

حاصل کرے،

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ

"مجھے قرآن کا فہم عطا کیا گیا تھا، لیکن جب میں نے ابوجعفر (المنصور) سے تھیلی لے لی، تو وہ فہم مجھ سے چھین لیا گیا، ہم اللہ سے اپنی اس مسامحت پر عفو چاہتے ہیں"[1]

چھوٹے پیشوں سے اجتناب

علم کے احترام کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایسے چھوٹے پیشوں کو اختیار نہ کریں جو اہل علم کے شایان شان نہ ہوں، جیسے حجامت، دباغت، صرافہ اور زرگسازی وغیرہ،

تہمت کے موقعوں سے اجتناب

انھیں تہمت کے مشتبہ موقعوں سے بھی بچنے کی ضرورت ہے، اگرچہ فی نفسہ وہ ان سے دور ہوں، اور نہ کوئی ایسا کام کرنا چاہئے، جو اخلاق کے بلند اصولوں کے منافی ہو، اور یا جو کام اصل میں برے نہ ہوں، مگر لوگ ظاہر میں انھیں بُرا سمجھتے ہوں، ان سے بھی دامن بچانا چاہئے، ورنہ لوگوں کو ان کے خلاف اپنے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے کا موقع ملیگا، اور وہ لوگوں کی نظروں سے گر جائیں گے، اور اگر ایسے موقعے پر جانے یا کوئی ایسا کام کرنے کی ضرورت پڑ جائے، تو کچھ لوگوں کو اس سے مطلع کر دینا چاہئے، تاکہ وہ لوگ اصل حقیقت سے پہلے سے آگاہ رہیں، اور بدگمانی پیدا ہونے کی نوبت نہ آئے[2]

مشاغل کی پابندی اور اوقات کی حفاظت

علما و اساتذہ کا فرض ہے، کہ وہ کوشش اور محنت میں ہمیشہ مصروف رہیں، اور ان کے عبادت کرنے پڑھنے پڑھانے، غور و فکر کرنے تصنیف و تالیف اور بحث و نظر کرنے میں ان کے جو معمولات ہوں، انھیں پابندی سے قائم رکھیں، ان کے سلسلہ کو نہ توڑیں،

انھیں اپنا وقت سب سے زیادہ عزیز رکھنا چاہئے مختلف غیر علمی و تعلیمی مشغولیتوں، کھانے پینے، ملنے ملانے روزی حاصل کرنے، راحت و آرام کرنے اور خانگی زندگی میں وقت گذارنے میں کم سے کم وقت صرف کریں، ربیع بن سلیمان مرادی، امام شافعی کے متعلق بیان کرتے ہیں، کہ

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۹، [2] ص ۲۰،

"میں نے انھیں دن کے وقت کھاتے اور رات کے وقت سوتے ہوئے نہیں دیکھا، وہ اپنے وقت کا بڑا حصہ تصنیف میں گذارتے تھے"،

حقیقت یہ ہے، کہ علم کا مرتبہ رسولوں کی جانشینی کے درجہ تک پہنچتا ہے، یہ بلند مرتبہ تکلیفیں اور مشقتیں اٹھائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، صحیح مسلم میں روایت ہے،

"جسم کی آسایش کے ساتھ علم کو تابع نہیں بنایا جا سکتا تھا"،

ایک دوسری روایت میں ہے،

"جنت تکلیفوں اور مصیبتوں سے حاصل ہوتی ہے"[1]

مطالعہ کا استمرار

علماء اور اساتذہ کو مطالعہ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھنا چاہئے، حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں،

"عالم اسی وقت تک عالم رہ سکتا ہے، جب تک وہ طالب علم ہے، جب وہ پڑھنا چھوڑ دے اور سمجھے کہ وہ علم سے بے نیاز ہو گیا، اور جو کچھ اس نے حاصل کر لیا، وہ اس کے لئے کافی ہے، تو لیا سمجھنے والا سب سے بڑا جاہل ہے"[2]

چھوٹوں سے استفادہ

علماء کیلئے تو یہ بھی معیوب نہیں کہ وہ اپنے چھوٹوں سے استفادہ کریں، علم کی تحصیل خواہ کسی صورت اور شکل میں کسی سے بھی ہو، وہ معیوب نہیں ہے[3]، حکمت مومن کی کھوئی ہوئی دولت ہے، اسے جہاں پائے اٹھا لے"، ایک دوسری روایت میں ہے، "حکمت کا کلمہ جہاں ملے، حاصل کرو، خواہ وہ مشرکوں کے ہاتھوں سے ہو"[4]

ابوبکر عبد اللہ بن زبیر حمیدی متوفی ۲۱۹ھ جو امام شافعی کے شاگرد تھے، فرماتے ہیں:-

"میں شافعی کی معیت میں مکہ سے مصر تک گیا، راستہ بھر ہم دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے، میں انسے فقہ کے مسئلے پوچھتا، اور وہ مجھ سے حدیثیں سنتے تھے"،

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں،

[1] تذکرۃ السامع ص ۲۶ و ۲۷، [2] ص ۲۹ و ص ۲۸، [3] ص ۱۲۵، [4] مختصر جامع بیان العلم،

"تم لوگ مجھ سے حدیث زیادہ جانتے ہو، اگر تمہارے پاس کوئی صحیح حدیث نکلے، تو مجھے بتادیا کرو میں تم سے لوں گا"[1]

اشہب بن عبدالعزیز کہتے ہیں:-

"میں نے ابو حنیفہ کو مالک کے سامنے ایسا دیکھا جیسے کوئی بچہ اپنے باپ کے سامنے ہو۔"

اس پر امام ذہبی فرماتے ہیں، "کہ یہ ابو حنیفہ کے حسن ادب اور تواضع کی بڑی دلیل ہے، حالانکہ وہ مالک سے تیرہ سال بڑے تھے"۔[2]

تصنیف و تالیف کا شغل: علماء کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ تصنیف اور تالیف میں مشغول رہیں، لیکن یہ دشوار گذار راہ اس وقت اختیار کریں جب اس پر چلنے کی پوری استعداد آگئی ہو، اور اثنائے راہ کی منزل کی دشواریوں سے پوری آگاہی ہو، علوم و فنون کے حقائق بیان کرنے کے لئے تفتیش و مطالعہ غور و فکر وغیرہ اور کتب کے مراجعہ کی ضرورت ہوتی ہے،

اپنی تصنیف کے لئے ایسا موضوع منتخب کریں، جس کا نفع عام ہو، اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہو، خصوصاً ایسی چیزیں لکھیں، جس پر پہلے سے کوئی تصنیف موجود نہ ہو، عبارت میں اعتدال قائم رکھیں نہ زیادہ طویل ہو اور نہ زیادہ مختصر کہ مفہوم واضح نہ ہو سکے،

اپنی تصنیف اس وقت تک شائع نہ کریں، جب تک اس پر نئے سرے سے نظر ثانی نہ کر ڈالیں اور اس کے مسائل و مباحث اور سیاق و سباق پر کامل غور و خوض نہ کریں،

اگر تصنیفی استعداد موجود نہ ہو تو ہرگز قلم ہاتھ میں نہ اٹھائیں، کیونکہ ہر عالم کے لئے مصنف ہونا ضروری نہیں ہے،[3]

اساتذہ و طلبہ کے باہمی تعلقات: اوپر بیان کیا جا چکا ہے، کہ اسلامی دور تعلیم میں استادوں اور شاگردوں کے

[1] تذکرۃ السامع ص ۲۹، [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۹۵، [3] تذکرۃ السامع ص ۲۹، ص ۳۰،

تعلقات خالص روحانی بنیادوں پر قائم تھے، استاد روحانی باپ اور شاگرد ان کے روحانی بیٹے تھے، چنانچہ ان دونوں کے باہمی تعلقات اور مراسم میں سب سے زیادہ یہی رشتہ نمایاں ہے، وہ ان کے اخلاق اور سیرت کے کامل نگہبان تھے، جس موقع پر شفقت و محبت کی ضرورت ہوتی شفقت سے پیش آتے، جہاں تنبیہ و تادیب کا موقع ہوتا، تنبیہ کرتے تھے، اشاروں و کنایوں میں نصیحت کارگر ہوتی، تو اشاروں سے کام لیتے اور تصریح سے روکنے کی ضرورت ہوتی، تو صاف گوئی سے کام لیکر روک دیتے، اساتذہ کے سامنے شاگردوں کی آیندہ زندگی کا سوال مستقل طور پر رہتا، اور اسی کے مطابق وہ ان کی تعلیم و تربیت کرتے تھے، بلکہ اساتذہ کا دستور سا مقرر ہو گیا تھا، کہ ہر طالب علم کو چند وصیتیں اس کے حسب حال لکھ کر اس کے سپرد کرتے تھے، جنھیں شاگرد اپنی آیندہ زندگی میں مشعل راہ بناتے تھے، چنانچہ مختلف ائمۂ اسلام کی وصیتیں سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں،[1]

استاد کی شفقت، استاد شاگردوں کے ساتھ غیر معمولی شفقت، لطف اور محبت سے پیش آتے تھے، ان کے اخلاق و عادات کی نگرانی اور ان میں اسلامی پاکبازی اور پرہیز گاری پیدا کرنے کے علاوہ ان کی ہر قسم کی ضرورتوں پر نگاہ رکھتے تھے، اگر وہ درس کے حلقہ میں خلاف معمول نہ آتے، تو ان کے متعلق دریافت کرتے، اور کسی معقول عذر کی صورت میں اُسے دور کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی طرح نادار لڑکوں کی پوشیدہ مالی مدد کرتے تھے، وہ بیمار پڑتے تو ان کی عیادت کو جاتے، ان کے گھر میں کوئی سانحہ پیش آتا، تو تعزیت کرتے، غرض معاشرتی زندگی میں جس نوعیت کے باہمی مخلصانہ تعلقات کی ضرورت ہوتی ہے، استاد اور شاگرد کی باہمی معاشرت میں ان کا صحیح نمونہ موجود تھا،

امام غزالی نے جہاں اساتذہ کو شفقت کرنے کی تلقین کی ہے، اس موقع پر وہ کہتے ہیں کہ معلم کا حق والدین کے حق سے زیادہ ہے، اور جس طرح والدین لڑکوں پر شفقت اور مہربانی کرتے ہیں اسی طرح ان کا بھی فرض ہے کہ وہ متعلمین سے شفقت اور مہربانی سے پیش آئیں،[2]

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۶۴ و تعلیم المتعلم، [2] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۳۶

قاضی ابن جماعہ استادوں کے لئے لکھتے ہیں، :-

"استاذ کو چاہئے کہ طالب علم کی ضرورتوں کا لحاظ رکھے اور اس کے ساتھ نرمی اور شفقت سے پیش آئے ہیں، اس پر احسان کرنے، اور اگر کبھی اس کی کوئی ایسی زیادتی ہو جو لوگوں سے پیش آجاتی ہے، تو اس پر صبر کرنے میں اور بعض وقت اس کی بدتمیزی برداشت کرنے میں، اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہئے، جو عزیز سے عزیز اولاد کے ساتھ کیا جاتا ہے"[۱]

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں، :-

"اساتذہ کو چاہئے کہ وہ طالب علموں کی مصلحتوں اور ضرورتوں کا لحاظ کرنے اور ان میں دل کی یکسوئی پیدا کرنے، اور اپنی استطاعت کے مطابق ان کی مالی مدد کرنے کی کوشش کریں کیونکہ جب تک کوئی بندہ اپنے بھائی کی اعانت کریگا خدا اس کی اعانت کرے گا، اور جو اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا، خدا اس کی حاجت روائی فرمائے گا، اور جو کسی تنگی کے لئے آسانی پیدا کرے گا، خدا قیامت کے دن کا حساب اس پر آسان کرے گا، خاص طور پر علم طلب کرنے میں اعانت کرنا افضل ترین ثواب کا کام ہے،

استاذ کو چاہئے کہ اگر کوئی طالب علم حلقہ سے خلاف معمول زیادہ غیر حاضر ہو جائے تو اس کا سبب دریافت کرنا چاہئے، اور جو لوگ اسے جانتے ہوں، ان سے اس کے حالات پوچھنے چاہئیں، اور اگر کسی سے اس کا حال معلوم نہ ہو سکے، تو کسی کو اس کے پاس بھیجنا چاہئے، بلکہ اگر وہ خود اس کے گھر جا کر اس کے حالات پوچھے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا"[۲]

سلسلۂ تعلیم کے جاری نہ رکھ سکنے کے موانع کو دور کرنا،

طالب علموں کی تعلیمی زندگی کے دور میں ایسے موانع پیش آتے ہیں کہ وہ اپنے تعلیمی ذوق کے باوجود مختلف خانگی وجوہ خصوصاً معاشی دقتوں کی وجہ

[۱] تذکرۃ السامع ص ۴۹، ۵۰، ۵۲، [۲] ایضاً ص ۶۳،

سے اپنی تعلیمی زندگی کے سلسلہ کو توڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اسلامی عہد میں اگر اس قسم کی دقتیں کسی طالب علم کو پیش آتی تھیں، تو اساتذہ ذاتی طور پر اس کی دستگیری کر کے اس کے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھتے تھے، قاضی ابو یوسف اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ،

"میں علم حدیث و فقہ کی تحصیل میں مصروف تھا، اور میری مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی، ایک دن میرے والد میرے پاس تشریف لائے، میں اس وقت ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر تھا، والد کے ارشاد کے مطابق مجلس سے اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لیا، انھوں نے فرمایا کہ تم ابو حنیفہ کو اپنے نمونہ نہ بناؤ، وہ خوشحال ہیں، اور تم معیشت کے لئے محتاج ہو، اس کے بعد میں نے مجبوراً تعلیمی مشاغل میں کمی کر دی، اور والد کی اطاعت میں، روزی کے سامان میں بھی لگا رہنے لگا،"

ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے مجھے حلقہ سے غائب پا کر میرے متعلق دریافت فرمایا:

"اس واقعہ کے بعد جب میں پہلی مرتبہ پھر ان کے حلقہ میں پہونچا تو انھوں نے مجھ سے غیر حاضری کی وجہ پوچھی، میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا، اس کے بعد جب لوگ حلقہ سے اٹھ کر چلے گئے تو انھوں نے ایک تھیلی میری طرف بڑھائی، اور فرمایا کہ اس سے کام نکالو اور حلقہ سے غیر حاضر مت ہو، جب یہ رقم خرچ ہو جائے، تو مجھے بتا دینا، چنانچہ اسکے بعد میں پابندی سے حلقہ میں شریک ہونے لگا، اس تھیلی میں سو درہم تھے، پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد انھوں نے سو درہم کی ایک اور تھیلی عنایت فرمائی"[۱]

طلبہ کی پوشیدہ مالی امداد

اساتذہ بوقت ضرورت طالب علموں کی پوشیدہ مالی مدد کرتے تھے، امام ابو حنیفہ کا واقعہ اوپر گذرا، ابو زکریا تبریزی کا بیان ہے، کہ وہ علامہ خطیب بغدادی سے ان کے درس کے حلقہ (جامع دمشق) میں علم ادب کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اور ان کا اسی جامع کے منارہ کے اوپر کے حجرے میں قیام تھا، ایک

[۱] وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۴۰۱،

مرتبہ ناگاہ شیخ خطیب بغدادی، اوپر کی منزل میں تشریف لے گئے، اور اپنے عزیز شاگرد سے کہا "آج جی چاہا کہ تم سے مل لوں" اس کے بعد ایک گھنٹہ تک باتیں کرتے رہے، چلنے کے وقت انھوں نے ایک ورق میری طرف بڑھا کر کہا کہ "یہ مسنون ہدیہ ہے، ان سے چند قلم خرید لینا" یہ کہہ کر وہ تشریف لے گئے، اس میں پانچ دینار تھے، پھر اس کے بعد دوسری مرتبہ آئے اور اتنی ہی رقم رکھ کر چلے گئے،[1]

قاضی اسد بن فرات امام محمد کی شفقتوں کے سلسلہ میں کہتے ہیں، :-

"میں ایک دن محمد بن حسن کے حلقۂ درس میں بیٹھا تھا، ناگاہ سبیل لگانے والے کی آواز آئی میں جلدی سے اٹھ کر گیا، اور پانی پی کر حلقہ میں واپس چلا آیا، اس پر محمد نے مجھ سے پوچھا مغربی! تم سبیل کا پانی پیتے ہو؟ میں نے عرض کیا "خدا آپ کو فلاح دے، میں تو ابن سبیل" ہوں، درس ختم کر کے میں گھر چلا گیا، رات کے وقت کسی نے دروازہ پر آواز دی، دروازہ کھولا تو معلوم ہوا، امام محمد کا خادم ہے، اس نے مجھ سے کہا، آقا نے آپ کو سلام کہا ہے اور آپ سے کہا ہے کہ مجھے آج سے پہلے بالکل معلوم نہ تھا، کہ تم "ابن سبیل" ہو، اس لئے اس نفقہ کو لیلو اور اپنی ضرورتیں پوری کرو۔

اس کے بعد اس نے ایک بھاری تھیلی میری طرف بڑھائی، میں دل میں خوش ہوا کہ اس میں درہموں کی بڑی تعداد ہے، جب میں نے آکر تھیلی کھولی تو دیکھتا ہوں کہ اس میں اسی اشرفیاں بھری ہوئی ہیں۔[2]

طلبہ کی عیادت، تعزیت اور غم گساری

اگر کوئی طالب علم بیمار پڑتا یا کسی غم میں مبتلا ہوتا تھا، تو استاذ اس کے مکان پر جا کر اس کی عیادت کرتا، اور اس مصیبت میں ہمدردی کر کے تعزیت کا فرض ادا کرتا تھا، اور اس موقع پر اسے کسی مدد کی ضرورت ہوتی تو امداد کرتا تھا، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں، :-

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۱۵، [2] معالم الایمان ابن ناجی،

"اگر طالب علم بیمار پڑے، تو استاد کو اس کی عیادت میں جانا چاہئے، اور اگر وہ کسی غم میں مبتلا ہو تو اس کا غم ہلکا کرنا چاہئے"۔[1]

اسلامی عہد میں اساتذہ طالب علموں کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کیا کرتے تھے، چنانچہ شیخ ابو وداعہ کا بیان ہے، کہ وہ حضرت سعید بن مسیب کے حلقۂ درس کے طالب علم تھے، شیخ نے انکی ایک مصیبت کے وقت جیسی ہمدردی اور غمگساری کی، اسکی مثال کم نظر آئے گی، ابو وداعہ کا بیان ہے کہ وہ اپنی بیوی کے سانحۂ وفات کی وجہ سے چند دنوں کے لئے حضرت سعید بن مسیب کے حلقۂ درس میں شریک نہ ہو سکے، اس کے بعد جب وہ حلقہ میں حاضر ہوئے، اور شیخ نے غیر حاضری کا سبب پوچھا، اور انھوں نے بیوی کے انتقال کی خبر سنائی، تو شیخ کو ملال ہوا، اور فرمایا کہ تم نے مجھے اطلاع نہ دی کہ میں جنازہ میں شریک ہو سکتا،

اسکے بعد حضرت سعید بن مسیب نے ان سے ان کی دوسری شادی کے متعلق دریافت کیا، انھوں نے افسوس کے ساتھ اپنی ناداری بیان کی، کہ ان کے پاس مہر ادا کرنے کے لئے دو تین درہم سے زیادہ رقم موجود نہیں، حضرت سعید نے پوچھا کہ اگر وہ سامان کر دیں تو نکاح کر سکتے ہیں،؟ ابو وداعہ نے اثبات میں جواب دیا، یہ سنتے ہی حضرت سعید نے اسی مجلس میں صرف دو یا تین درہم پر اپنی صاحبزادی کو ابو وداعہ کی زوجیت میں دے دیا،

ابو وداعہ حلقہ سے اٹھنے کے بعد گھر آئے، اس دن روزہ سے تھے، شام کو افطار کر کے گھر میں بیٹھے تھے، کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی، ابو وداعہ نے نام پوچھا تو باہر سے جواب آیا کہ "میں سعید ہوں"، ابو وداعہ کو تعجب ہوا کہ اس نام کے کئی بزرگ شہر میں موجود ہیں، سعید بن مسیب ہو نہیں سکتے، کہ وہ چالیس سال سے سوائے اپنے گھر سے مسجد جانے کے کہیں اور جاتے دکھائی نہیں دیئے، اسی خیال میں انھوں نے دروازہ کھولا، دیکھتے ہیں کہ ان کے استاد سعید بن مسیب ہی سامنے موجود ہیں، ابو وداعہ نے شرم کے ساتھ معذرت کی، کہ انھوں نے خود کیوں تکلیف کی، کسی کے ذریعہ طلب فرما لیا ہوتا، حضرت سعید بن

[1] تذکرۃ السامع ص ۶۲، ۶۳،

سیب نے فرمایا کہ

"میں اس لئے چلا آیا، کہ آج تمھارا نکاح ہوا ہے، یہ اچھا معلوم نہیں ہوا کہ تم اپنے گھر میں تنہا رات گذارو، یہ میرے ساتھ تمھاری بیوی موجود ہیں"

یہ کہہ کر اپنی صاجزادی کو دروازہ کے اندر کردیا، ابو وداعہ کہتے ہیں کہ حضرت سعید کی یہ صاجزادی وہی تھیں جن سے خلیفہ عبد الملک بن مروان نے اپنے ولی عہد ولید کیلئے پیغام بھیجا تھا، اور حضرت سعید نے یہ رشتہ قبول کرنے سے انکار کردیا تھا، اور یہ خود بھی عالمہ فاضلہ محدثہ اور حافظ قرآن تھیں[۱]

مذاکرہ ومناظرہ اساتذہ، علوم کے تازہ رکھنے کے لئے باہمی مذاکرہ کرتے تھے، نیز مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کرکے ان کے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کرتے تھے، اسلامی عہد میں ان مذاکروں کا بڑا رواج تھا، انہی سے مناظروں کی ابتداء ہوئی، ان مذاکروں اور مناظروں میں بہت سے مسئلے معلوم ہوجاتے تھے، اس لئے ان میں وہ بڑی توجہ اور انہماک سے وقت صرف کرتے تھے، علی بن حسن بن شقیق کا بیان ہے، کہ ایک مرتبہ وہ اور ابن مبارک مسجد سے عشا کی نماز پڑھکر مکان جانے کے لئے اٹھے، سردیوں کا زمانہ تھا، نیز سردی پڑرہی تھی، ابن مبارک نے چلتے وقت ابن شقیق سے مسجد کے دروازہ کے پاس کسی حدیث کا تذکرہ کیا، انھوں نے جواب میں کوئی بات کہی اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہوگیا، اس وقت سے وہ دونوں مسجد کے دروازہ پر اسی طرح ٹھنڈی رات میں شبنم میں کھڑے گفتگو کرتے رہے، یہاں تک کہ مؤذن آیا، اور اس نے صبح کی اذان دی اسوقت انھیں اس قدر دیر ہوجانے کی خبر ہوئی[۲]

جب اہل علم کسی دوسرے شہر سے آتے تھے، تو وہاں کے احباب اس شہر کے علمی تحفہ کو بڑے اصرار سے اپنے رفیق سے طلب کرتے تھے، ابو علی نیشاپوری کا بیان ہے، کہ وہ بغداد آئے، یہاں مختلف اہل علم ابو احمد غسال، ابو اسحق بن حمزہ، ابو طالب بن نصر اور ابو بکر جعابی جمع ہوئے، اور ابو علی سے ایک مجلس میں نیشاپور

[۱] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۲۵۹، [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۵۵،

کی حدیثوں کی روایتیں سنانے کے لئے کہا گیا، انھوں نے پہلے تامل کیا، لیکن جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو انھوں نے اس مجلس میں تیس حدیثیں روایت کیں، جن میں ایک حدیث کے سوا کوئی ایسی نہ تھی، جو ان میں سے کسی کے پاس پہلے سے موجود ہو، البتہ ابو حمزہ نے صرف ایک حدیث کے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیا[۱]

علماء کی شرکت اساتذہ کے حلقوں میں اس زمانہ میں علماء کو اس کی عام اجازت تھی، کہ وہ اپنے معاصرین کے درس وتعلیم کے حلقوں میں شریک ہوں، اور درس کے درمیان میں استاذ کی تقریر پر نکتہ چینیاں اور سوال وجواب سے مسئلوں کی چھان بین کریں، ایسے مواقع دراصل بڑے نازک ہوتے تھے، اہل علم کی بھری محفل میں استاذ کی خفت کا سامان ہوتا تھا، اساتذہ اپنے خطبوں پر خود اس قدر تیار ہوکر آتے تھے، کہ وہ بڑے سے بڑے فاضل اجل کے درس کے حلقہ میں آجانے پر بھی مرعوب نہ ہوتے تھے، اور سوالوں کے تشفی بخش جوابات دیتے تھے،

البتہ سیرت کی کتابوں میں ایسے واقعات بھی ہیں، کہ کبھی کبھی بعض مناظرہ پسند طبائع درس کے حلقہ میں استادوں پر ناروا حملے کرتے، اور طعن وطنز سے محفلوں کو مکدر کردیتے، اساتذہ بھی ایسے لوگوں کی طبیعتوں اور عادتوں سے واقف ہوگئے تھے، جب کوئی ایسا موقع آتا، تو بڑی خوش اسلوبی سے نباہ لیتے تھے، سیوطی نے محمد بن منصور سمعانی کے حلقۂ درس کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے، کہ ایک مرتبہ ان کے حلقۂ درس میں ایک مغربی اہل علم شریک ہوئے، جو کسی قدر تیز اور مناظرہ پسند واقع ہوئے تھے، اور اہل علم میں ان کے مناظروں کی شہرت ہوچکی تھی، ان کے ایک اعتراض کے جواب میں سمعانی نے شاگردوں کو کہا

"جو کچھ آپ فرماتے ہیں اسے لکھ لو، آپ اس سے زیادہ واقف ہیں"

شاگردوں نے بلا تامل تصحیح کرلی یہ طرز عمل دیکھ کر تھوڑی دیر کے بعد نو وارد اہل علم نے پھر کہا

"میرے آقا مجھ سے خطا ہوئی، صحیح وہی ہے جو آپ نے املا کرایا تھا"

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۱۱،

سمعانی نے پھر دوبارہ تصحیح کرادی، اس کے بعد جب وہ مجلس سے چلے گئے، تو سمعانی نے شاگردوں سے کہا "یہ حضرت سمجھے تھے، کہ میں بھی ان سے دوسروں کی طرح الجھ پڑوں گا، اور میرے ساتھ بھی یہ ایسی ہی تیز زبانی سے پیش آئیں گے جیسے دوسروں کیساتھ کرتے رہے ہیں، اسی لئے میں خاموش ہوگیا، اور بالآخر وہ خود رجوع کرنے پر مجبور ہوئے"[۵۱]

مجلس مناظرہ ان مذاکروں سے اس زمانہ میں مناظروں کا عام رواج ہوگیا تھا جن میں استاد اور شاگرد دونوں شریک ہوتے، اور مختلف علوم حدیث، فقہ، کلام اور ادب پر مناظرے کی علٰحدہ علٰحدہ مجلسیں منعقد ہوتیں، اہل علم سلاطین و امراء کے درباروں میں یہ مجلسیں زیادہ گرم ہوتی تھیں، ملک شاہ کے دربار کے مناظرے یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں، جو امام غزالی اور دوسرے علماء زمانہ سے ہوئے تھے، ان مناظروں میں اگرچہ کبھی کبھی طرفین حق سے ہٹ کر مناظرانہ ردوکد میں مبتلا ہوجاتے تھے، لیکن عموماً اس زمانہ میں صحیح علمی مذاق اور حق کو حق سمجھ کر قبول کرنے، اور باطل کے باطل ٹھہرنے پر اس سے رجوع کرلینے کی خوبیاں موجود تھیں، اسلئے مناظروں کی ان مجلسوں سے علما، اور طالب علموں دونوں کو فائدے حاصل ہوتے، اور دقیق علمی حقائق آشکارا ہوتے تھے،

پانچویں صدی تک مناظروں کی مجلسوں میں جو بے عنوانیاں پیدا ہوچکی تھیں، اور ردوکد کے مناظروں سے جو برائیاں پیدا ہوتی تھیں، انھیں امام غزالی نے احیاء العلوم میں بیان کیا ہے، اور ان سے احتراز کرنے کی تلقین کی ہے، بلکہ وہ ایسی مناظرانہ مجلسوں کے سرے سے مخالف تھے[۵۲] کیونکہ وہ خود تلخ تجربے اٹھا چکے تھے،

(۵)

طلبہ کے فرائض

اسلامی مدرسوں کے طالب علموں کے ذمہ جو فرائض تھے، ان کا اندازہ قاضی ابن جماعہ کی ان

[۵۱] بغیۃ الوعاۃ سیوطی ص ۵۰ ۔ [۵۲] احیاء العلوم جلد ا کتاب العلم

تصنیفوں سے ہوتا ہے، جو انھوں نے ایک مستقل باب میں طالب علموں کے لئے مختلف فصلوں "طالب علم کے آداب اپنی ذات کے متعلق، طالب علم کے آداب اپنے استاذ کے ساتھ، طالب علموں کے درسوں کے آداب درس کے حلقہ میں پڑھنا، اور حلقہ میں استاد اور شاگرد کے ساتھ اس کا برتاؤ، پھر محشی نے تاریخ اور سیرت کی کتابوں سے جابجا مثالیں دی ہیں، طلبہ کے یہ آئین و آداب چار قسموں میں کئے جاسکتے ہیں، ایک تو طالب علموں کے فرائض اپنی ذات کے متعلق، دوسرے استادوں اور شاگردوں کے باہمی معاشرتی اور تعلیمی تعلقات اور تیسرے طالب علموں کے واجبات دارالاقامہ میں، اور چوتھے طلبہ کی ذمہ داریاں ان کے حلقۂ درس میں ان میں سے تیسری قسم یعنی دارالاقامہ میں طلبہ کے فرائض کی تفصیل اوپر گذر چکی، حلقۂ درس میں ان کے جو واجبات ہیں، ان کا بیان آگے آئے گا، بقیہ اول الذکر دونوں قسموں کے فرائض اجمالاً ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں،

طلبہ کے ذمہ خود ان کی ذات کے متعلق جو فرض عائد تھے، انکی بھی دو قسمیں کیجاسکتی ہیں، ایک خود ان کی شخصی اخلاقی تعلیم و تربیت، اور دوسرے ان کے تعلیمی فرائض،

دل کی پاکی اور نیت کا اخلاص طلبہ کی سیرت کے نشوونما کے لئے پہلی شرط یہ تھی، کہ ان کے دل اور دماغ معصومانہ طور پر پاک اور صاف رہیں، برے اخلاق اور اوصاف سے دامن بچائیں، دل کی پاکی کے ساتھ ان کی تعلیمی زندگی کا آغاز پورے حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ ہوا ہو، اور اسلام نے جو تعلیمی نصب العین مقرر کیا ہے، وہ ہر وقت انکی نگاہوں کے سامنے ہو،[۵۳]

علم کے لئے سفر اس زمانہ میں ہر طالب علم کا فرض تھا، کہ وہ علم کی طلب کے لئے کوئی نہ کوئی سفر ضرور کرے علم حاصل کرنے کیلئے سفر کرنے کی ابتدا صحابہ کے زمانہ ہی میں ہوئی تھی، جیسا کہ پہلے گذرچکا صحابہ ایک ایک حدیث کی تصدیق کیلئے حجاز سے شام اور شام سے مصر کا سفر کرتے تھے، پھر تابعین نے انہی کے طریقہ کی پیروی کی، بشر بن عبد اللہ حضرمی کہتے ہیں کہ وہ صرف ایک حدیث کے لئے شہر بہ شہر پھرتے رہے ہیں، حضرت

[۵۳] تذکرۃ السامع ص ۷۰، [۵۴] احیاء العلوم ج ا ص ۳۲ و تذکرۃ السامع

سعید بن مسیب نے بھی صرف ایک حدیث کیلئے کئی دن اور رات کا سفر کیا[۱]، طلبہ بلا تکلف مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب صرف علم کی طلب میں جایا کرتے تھے، مقری صاحب نفح الطیب، ابن ناجی صاحب معالم الایمان اور صاحب ریاض النفوس وغیرہ نے ایسے طالب علموں کا حال اپنی کتاب میں مستقل باب قائم کرکے لکھا ہے، جو علم کی تحصیل میں اسپین اور افریقہ سے شام، حجاز، عراق اور مصر گئے، اور پھر ان مقاموں سے افریقہ اور اسپین میں داخل ہوئے یہ علمی سفر طلبہ عموماً پیدل طے کرتے تھے، اور ان سفروں میں سینکڑوں میل چل لیتے تھے، مثال کے طور پر ابو حاتم رازی کو پیش کیا جا سکتا ہے، وہ کہتے ہیں :۔

"میں نے سفر میں پہلے سات برس قیام کیا، اور ایک ہزار فرسخ سے زیادہ چلا، پھر میں نے فرسخ کو شمار کرنا چھوڑ دیا، اور بحرین سے مصر تک پیدل چلا، پھر وہاں سے رملہ پیدل آیا، اور اس کے بعد پیدل ہی طرطوس پہنچا، اس سفر میں میرے بیس سال پورے ہو گئے"[۲]

حافظ ابو یوسف یعقوب بن سفیان فسوی نے تیس سال سفر میں گذار دیے[۳]،

حضرت ابو عبد الرحمن بقی بن مخلد قرطبی نے دو سو اسی[۲۸۰] شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا، لیکن اسکے باوجود ان کا بیان ہے کہ انھوں نے ہر استاد سے پیدل چل کر حدیث سنی ہے، یہ اساتذہ مختلف ملکوں اور شہروں کے تھے[۴]،

امام بخاری نے سولہ سال کی عمر میں اپنے شہر کی حدیثیں سننے کے بعد علم کی طلب کے لئے سفر شروع کیا، باپ کا سایہ موجود نہ تھا، ضعیف ماں اور بہن اس طالب علم کی نگہداشت کیلئے اس کے ساتھ ہو گئیں، اور مختلف شہروں بلخ، بغداد، بصرہ، کوفہ، شام، عسقلان، دمشق اور مصر وغیرہ میں پہونچکر وہاں کے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا[۵]،

امام دارمی نے حرمین، خراسان، شام، عراق، اور مصر جا کر علم کی تحصیل کی[۶]،

۱؎ جامع بیان العلم ص ۴۶، ۴۷، ۴۸ ۲؎ تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۴۶ ۳؎ ر ص ۱۶۰، ۴؎ ر ص ۲۰۴ - ۲۰۵ ۵؎ ر ص ۱۳۱ ۶؎ ر ص ۱۱۵،

اس زمانہ میں طالب علم، علم کی طلب کے لئے سفر کرنے کا دلی شوق رکھتے تھے، حافظ ابو بکر بن ابراہیم اسماعیلی اپنی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ

"جب محمد بن ایوب رازی کی وفات کی خبر پہونچی تو میں رونے اور چیخنے لگا، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، اور سر پر خاک ڈالنے لگا، یہ دیکھکر میرے گھر کے لوگ جمع ہو گئے، اور اس مصیبت کا حال پوچھا، میں نے کہا کہ محمد بن ایوب آخر وفات پا گئے، اور تم لوگوں نے مجھے ان کے یہاں تک پہونچنے سے باز رکھا، یہ سن کر لوگوں نے مجھے تسلی دی اور مجھے طلب علم کیلئے نکلنے کی اجازت دی، اور میرے ماموں کو میرے ساتھ کر دیا، اور میں شہر نسا، حضرت حسن بن سفیان کی خدمت میں روانہ ہو گیا، یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب یہاں (اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرکے) ایک بال بھی نہ تھا[۱]"

حافظ ابو علی حسن بن صاحب ابن حمید شاشی متوفی ۳۱۴ھ خراسان کے شیوخ سے حدیث لکھنے کے بعد عراق شام اور مصر کا سفر کیا[۲]، حافظ محمد بن ابراہیم بن حیون اندلسی متوفی ۳۰۵ھ نے اندلس کے شیوخ سے پڑھنے کے بعد عراق، حجاز اور یمن آکر علم کی تحصیل کی[۳]، حافظ ابو بکر محمد بن ابراہیم معروف با بن مقری نے تحصیل علم میں اصفہان، بغداد، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تستر، مکہ، بیت المقدس، دمشق، بیروت، عکا، رملہ، آذنہ، واسط، عسکر، حمص، رقہ اور مصر کی خاک چھانی، وہ کہتے ہیں "میں نے مشرق و مغرب کا چار مرتبہ طواف کیا ..... اور میں نے ابن فضالہ کے ایک نسخہ کی خاطر ستر مرحلے طے کئے اور وہ نسخہ اگر نانبائی کو دیا جاتا، تو اس کے بدلہ میں وہ ایک روٹی بھی نہ دیتا، ..... میں صرف بیت المقدس دس مرتبہ گیا ہوں[۴]، حافظ ابن مفرج ابو عبد اللہ محمد بن احمد قرطبی شہر قرطبہ میں تحصیل علم کرنے کے بعد مزید تحصیل کیلئے

۱؎ تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۱۶۱ ۲؎ ر ص ۳ -

۳؎ تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۵ ۴؎ ر ص ۱۸۲ و ص ۱۸۳

روانہ ہوئے، طرابلس، مصر، دمشق، جدہ، صنعاء، زبید اور بیت المقدس پہونچکر حدیث کی تحصیل کی[۱]، حافظ ابو نصر احمد بن محمد رازی متوفی ۳۹۲ھ پیدائشی نابینا تھے، تاہم انھون نے تحصیل علم کے شوق میں بخارا، نیشاپور، بغداد اور بلخ کا سفر کیا، اور یہاں کے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا[۲]، حافظ ولید بن بکر بن مخلد سرقسطی اندلس کے دور دراز مقام سے خراسان تک آئے، اور تحصیل علم میں مصروف رہے، اور دینور (ایران) میں ۳۹۲ھ میں وفات پائی[۳]، حافظ ابو زکریا عبد الرحیم بن احمد تمیمی بخاری متوفی ۴۶۱ھ، بخارا میں حدیث سننے کے بعد خراسان، شام، یمن، مصر، اور افریقہ کا سفر کیا[۴]، حافظ محمد بن طاہر مقدسی بیت المقدس کے شیوخ حدیث سے پڑھنے کے بعد اس عہد میں جہان علم کی خوشبو سونگھی، پاپیادہ دوڑے گئے، چنانچہ مشہور مقامات بغداد، مکہ، تنیس، دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشاپور، ہرات، جرجان، آمد، استراباد، بوشنج، بصرہ، دینور، رے، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ، موصل، مرو، حرمین، نہاوند، ہمدان، واسط، اہواز اور بسطام وغیرہ میں انھون نے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا، اور جہاں گئے، وہان نہ صرف پاپیادہ گئے، بلکہ کتابوں کا پشتارا بھی پیٹھ پر لادے رہتے، ان کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ روزانہ ۲۰ فرسخ (۶۰ میل) پیدل چل لینے پر قادر تھے[۵]، ایک مرتبہ حافظ ابو عبد اللہ محمد بن عبد الواحد اصفہانی جن شہروں تک طلب علم میں پہونچے تھے، ایک مرتبہ ان کے نام گنانے لگے، تو ایک سو بیس مقامات نکلے[۶]،

امام شعبی فرماتے ہیں، :-

"اگر کسی شخص نے شام کے اس سرے سے یمن کے اوس سرے تک صرف اسلئے سفر کیا کہ وہ حکمت کا ایک کلمہ سن لے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس نے اپنا سفر ضائع نہیں کیا[۷]"۔

پھر خود فرماتے ہیں، میں صرف ایک حدیث کی طلب میں رات رات اور دن دن بھر چلا ہوں[۸]۔

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۱۴، [۲] " ص ۲۳۲، ۲۳۳، [۳] " ص ۲۸۱، ۲۷۷، [۴] " صفحہ ۳۵۱، [۵] " جلد ۴ ص ۳۹ تا ۴۱، [۶] " صفحہ ۵۳، [۷] مختصر کتاب العلم ص ۴۷، [۸] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۷۸،

امالی ابی علی القالی و اللآلی

از

مولینا ابو عبد اللہ محمد بن یوسف بن محمد السورتی

(۲)

۱- ص ج "کان یمسکھا فی سبابی الشرب" حاشیہ پر لکھا ہے "کذا و فی تصحیح الحلۃ سبائی" پھر لکھتے ہیں "ولا اعرفہ الا سبائب الشرب" تصحیح حلہ پر اعتراض سے قبل اس لفظ کو لغات سے دریافت کر لیتے تو "لا اعرف" کا جملہ نہ نکالا جاتا، "سبائی" جمع "سبنیۃ" ایک قسم کا عمدہ کپڑا ہے، جو سن وغیرہ سے تیار ہوتا ہے، یہ سبن کی طرف منسوب ہے، خود فاضل میمن صاحب نے ص ۱۴۹ پر اسے نقل کیا ہے، پھر "لا اعرفہ" چہ معنی دارد؟ "سبابی" سے "سبائی" کس قدر قریب ہے! "سبائب" کی طرف جانا بعید از عقل ہے، اور اسی کے تتبع میں سارا وقت مصحفی حضرات صرف کرتے رہتے ہیں،!

۲- ص "والیک یصل ادنی ظلم" اس پر میمن صاحب "کذا" لکھ کر روانہ ہو گئے ہیں، حالانکہ "فصیح ثعلب" اور درسی اطفال کی کتابوں میں یہ لفظ مل جائے گا، دیکھئے "لقیتہ ادنی ظلم، و ادنی ذی ظلم، ای اول کل شیء"،!

۳- ص "وابزعھم فی العلوم طلقا" "قولہ الطلق النصیب" اس جگہ الطلق اس معنی میں نہیں بلکہ شوط و جری یعنی ایک دوڑ کے معنی میں ہے،

۴- ص "ولہ تقدم مسبق، و سلف صدق" لفظ "سبق" پر "کذا" لکھنا عجز کا ثبوت ہے، "سبق"

یا بکسر السین ہو، جو نیطرا اور شل کے معنی میں ہے، یا سنق بالنون ہو، جو خوش حال کے معنی میں ہے،

۵۔ ص ح "من البیض مرسا" اس پر بھی کذا لکھکر آگے بڑھ گئے ہیں "یہ تربا" ہے جو اتراب کے معنی میں آیا ہے،

۶۔ ص ح "اذا مرضت ارض الاحیۃ حادھا" "حاد" یا "جاد" دونوں غلط ہیں، شاعر طباق کا بہت گرویدہ ہے، مرض کے واسطے عیادت کی ضرورت ہے، اسی کو "عادھا" سے بتا رہا ہے،

۷۔ "یضوع بوادیک الاغن اغانیا" "یضوع" مہمل ہے، صحیح "یصوغ" ہے،

اب اصل کتاب "اللآلی" پر بحث شروع ہوتی ہے، وباللہ التوفیق،

۸۔ ص ۴ پر شارح نے "مرتفع بناہ" کو بتقدیم با لکھا ہے، جو بالکل صحیح اور ناقابل اعتراض ہے، مگر میمن صاحب اسے "نباہ" بنانے کے درپے ہو گئے، اور اصل کو جو ہر طرح صحیح تھی مصحف بتا دیا، تصحیف "بناہ" نہیں "نباہ" ہے، اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں،

اولاً صحیح اصول میں "بناہ" موجود ہے، اس کے بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں،

ثانیاً اس کے معنی ہر طرح سے صحیح ہیں، "ارتفاع بنا" بکثرت مستعمل اور شرف و علو حقیقی و مجازی دونوں معنوں میں عام ہے،

ثالثاً شارح غریب لغات حل کر رہا ہے، خود غریب لغات کا کوئی مجموعہ نہیں تیار کر رہا ہے،

رابعاً سیکڑوں مقامات پر رفیع العماد، عالی البناء، مرتفع البناء وغیرہ ملے گا، "نباہ" میمن صاحب کے نزدیک صحیح ہو تو ہو، اور کسی جگہ اس کا استعمال نادر ہو گا، کم از کم وہ ایک ہی شعر اسکی سند میں پیش کر دیں،

خلّ الطریق لمن یبنی المنار بہ   وابرز ببرزۃ حیث اضطرّک القدرُ

۹۔ ص ۴ "واذا اعطی اقنع" "فنع بالفا" مال کثیر، بعضے "اقنع" بالقاف روایت کرتے ہیں، حاشیہ پر میمن صاحب لکھتے ہیں ایک تو "فنع" کو شارح نے ذکر نہیں کیا، دوم کتب لغت میں یہ نہیں ملتا،!

شارح نے خطبہ میں صرف دو لفظ غریب سمجھ کر ان کی تحقیق کی ہے، حالانکہ اور بھی بہت سے الفاظ ان دونوں جیسے یا ان سے زیادہ مشکل ہوں گے، یہ ان لوگوں کا مذاق علمی تھا اس سے کوئی استدلال نہیں کیا جا سکتا، مثلاً "السحیا" "المحسب" "الاسماد" "الشمال الازل" "القصرۃ" وغیرہ الفاظ خطبہ میں آئے ہیں، غرض اس بیان سے عدم ذکر "فنع" کی بنا پر "قنع" ہونا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا،

کتب لغت میں "فنع" اور "فنیع" وغیرہ الفاظ موجود ہیں، یہ استیناس کے لئے کافی ہیں، پھر کسی کتاب میں لغات و محاورات کا استقصا نہیں کیا گیا، نہ اس کا کسی نے دعوی کیا ہے، نیز میمن صاحب یہ بتائیں کہ ان کے پاس اصول ولغت کی کتنی کتابیں ہیں، اور "افعال" کے متعلق جو اہم کتابیں ہیں، وہ انھوں نے دیکھی ہیں اور ان میں اس لفظ کی تحقیق ہے، بہر حال "افنع" کی جگہ "اقنع" لانے کی ضرورت نہیں یہ تصحیف ہو گی،!

لطیفہ:۔ (۱) عرصہ ہوا کتاب الالفاظ ابن السکیت کا نسخہ بیروت کے عیسائیوں نے بڑی محنت سے شائع کیا، اس کے حواشی و انڈکس بنائے، اس کا مختصر بھی شائع کیا، اس کے ص ۱۰ پر یہی "فنع" کو "قنع" بالقاف لکھ کر پوری طرح اس کی تصحیف کی، شعروں کو بگاڑا، انتہا یہ ہے کہ فہرست میں بھی "فنع" کی جگہ "قنع" ہی رکھا، حالانکہ ایک نسخہ حاشیہ پر بالفا بھی ہے، اب لوئیس یسوعی، اور اس کے ساتھی عربی ذوق سے بالکل نابلد تھے، اپنی تبشیر کی دھن میں انھوں نے وہ عجیب کام کئے ہیں کہ بجز افسوس اور ان کے جہل مرکب کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا، یہ لفظ دو شعروں میں آیا ہے، ان میں سے ایک کو بسکون النون لکھا، اور دوسرے کو بفتح النون، پہلا حاتم طائی کا ہے،

اذا نابت نوائب تعترینی   ولا اعتل فی فنع بمنع،

دوسرا ابو محجن الثقفی کا،

وقد اجود وما مالی بذی فنع   واکتم السر فیہ ضربۃ العنق

لطیفہ:۔ (۲) یہ کوئی عجیب غلطی نہیں، مستشرقین جن کے پاس دنیائے مشرق آج سند لینے کے

واسطے پہونچی ہے، اس طرح کے عجائب و غرائب کا منبع و معدن ہیں، چنانچہ افعال ابن القوطیہ کے فاضل مصحح نے کئی الفاظ اسی قسم کے اصل میں مصحف و محرف کئے پھر فہرست میں انھیں اسی طرح لکھدیا مثلاً:-

۱۔ "ضدم" کی جگہ ص ۲۵۲ پر "صرم" طبع کیا، اور فہرست میں بھی یہی رکھا،

۲۔ ص ۲۵۲ پر "صدت" کی جگہ "صرف" لکھا، اور اسی طرح فہرست میں بھی لکھا،

۳۔ ص ۳۱۶ پر "وخذۃ" بالذال لکھا، اور اسی طرح فہرست میں، حالانکہ "وخز" بالزاء ہے،

۴۔ ص ۳۰۰ پر "تخر الکلبُ الانار" حالانکہ صحیح "لجذ" ہے، ذٰلکَ مبلغھُم منَ العِلمِ وکم لھُم مِن اَمثالِ ھٰذہٖ الطامات وَما یعقلھا الا العالمون،

۱۰۔ ص ۵ پر ابو موسیٰ اشعری کی حدیث کا شارح نے حوالہ دیا ہے، جسکی بابت میمن صاحب حاشیہ[1] تحریر فرماتے ہیں:-

"اس حدیث کو احمد شیخین، اور ترمذی نے انس سے اور احمد و شیخین نے ابن عباس سے [اور] بخاری نے ابن الزبیر سے، اور ابن ماجہ نے ابو ہریرہ سے اور احمد نے ابو واقد سے اور بخاری نے تاریخ میں اور بزاز نے بریدہ سے روایت کیا"

فاضل محشی نے یہ نہیں سمجھا کہ یہ حدیث کس مضمون کی ہے؟ جس کی تخریج مطلوب ہے، شارح نے ابو موسیٰ اشعری کی مخصوص حدیث پیش کی ہے، پہلے اس کی تخریج کرتے، پھر اس کے شواہد پر زور دیتے، بجائے اس کے ادھر ادھر کی روایتوں کے ذکر سے کیا فائدہ،

اوردھا سعد وسعد مشتمل ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ماھکذا تورد یا سعد الابل

اولاً شارح نے جس مضمون کی حدیث جس صحابی سے پیش کی ہے، اسکی تخریج کیجاتی، ثانیاً:- دوسری روایتیں جو پیش کی ہیں، کیا وہ اس مدعا کے واسطے سند ہیں، جسے شارح نے پیش کیا، اگر نہیں ہیں تو ان کا ذکر فضول ہے، اگر ہیں تو پیش کیا جائے، ھذا موضع المثل لیس بعشک[2]

[...]ہجی، اشعار کا حوالہ دیتے دیتے میمن صاحب فن حدیث پر پہونچ گئے، یہ الگ میدان ہے اس کے [وا]سطے تیاری کی ضرورت ہے، ورنہ یہ مقولہ صادق آئے گا،

من تحلی بغیر ما ھو فیہ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ ‌ فضحتہ شواھد الامتحان

۱۱۔ ص ۶، حدیث زہری عن ابی امامہ بن سہل بن حنیف کی تخریج چھوڑ دی، اسی طرح اس صفحہ [پ]ر ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث تھی، ص ۷ پر بجز ایک روایت کے کسی کی تخریج نہ کی، اور ابو سعید [...]ضاری کی روایت پر غیر ضروری حاشیہ لکھدیا، کاش اسکی تخریج کیجاتی!

۱۲۔ ص ۹ "نسیٔ" کی بابت شارح نے لطیف بحث کی ہے، میمن صاحب بغیر سمجھے ہوئے غلط در غلط الا ستدلات [پ]ر اس کو غلط بتانے کی فکر میں ہیں، دراصل شارح نے "نسیٔ" کی صورت بتائی ہے، جو عموماً کبیسہ کی صورت [م]یں ہوتی تھی، اس کے علاوہ بھی وہ بلا تقیید ردوبدل کیا کرتے تھے، ہم اس جگہ میمن کے اغلاط شمار [ک]رتے ہیں!

الف:- ص ۹ "وفی التاج عن ابی کناسۃ کما قال البکری" یہ غلط ہے، صحیح "عن ابی کناسۃ عن شیوخہ" ہے،

ب:- ص ۱۰ "اولھم علی ما فی السیرۃ والتاج عن المفضل عباد بن حذیفۃ" یہ سیرۃ [او]ر تاج دونوں پر صریح بہتان ہے، ان دونوں کی جگہ حذیفہ بن عبد ہے، جیسا کہ ابن حبیب نے کہا ہے،

ج:- ص ۱۰ "او قال اللیثی" یہ جاحظ ہے، اگر میمن صاحب فضول تخریجات میں پوری قوت صرف کرنے کے باوجود ایسی ضروری تخریج چھوڑ گئے،

۱۳۔ ص ۱۱ "لا بن جذل الطعان عمیر بن قیس الکنانی" اس جگہ میمن صاحب نے کمال کیا ہے، [ی]ہاں اصل نسخہ میں "لجذل الطعان عمرو" تھا، حاشیہ نمبر ۱ پر میمن صاحب نے یہ لکھا، پھر حاشیہ نمبر ۲ پر لکھتے ہیں "الاصل لجذل الطعان عمیر" یہ کتنا کھلا تناقض ہے!

اس کے علاوہ دو زبردست تحریفیں فاضل مذکور نے کی ہیں، ایک "عمرؔو" کو "عمیر" لکھنا، دوم "جذل الطعان" کو "ابن جذل الطعان" بنانا، کاش اصل نسخہ کو اپنی حالت پر چھوڑنے کے بعد حاشیہ پر جس طرح چاہتے، گفتگو کرتے، اس میں ایک تو امانت داری ہوتی، دوم تحقیق کرنے والے کیلئے میدان صاف ہوتا، اس طرح اصل کتاب کو مسخ کرنا اہل علم کی شان سے بعید ہے!

البکری نے "جذل الطعان" اور "عمرؔو" کہا، دوسروں نے کبھی اس طرح کہا، کبھی "عمیر" اور "ابن جذل الطعان" عمرو اور عمیر کی بحث چنداں قابلِ اعتنا نہیں، ہوسکتا ہے، کہ ایک ہی شخص کو دو طرح سے پکارتے ہوں، یا روایت کا اختلاف ہو، اس کا آخری فیصلہ اس وقت ممکن ہے، جبکہ یہ شخص خود ہمارے پاس آکر اپنے صحیح نام کو پیش کرے، وذلک امرٌ محالٌ،

رہا "جذل الطعان" دراصل کسی کا لقب ہے، میمن صاحب نے "جذل الطعان" کو "ابن جذل الطعان" بنایا، اس پر بھی بس نہیں کیا، اور سیرۃ کی عبارت کی نقل میں بھی جس میں "عمیر بن قیس جذل الطعان" ہے "ابن" کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کردیا، آخر اس قدر ردّ و بدل کی ضرورت کیا تھی؟

ائمۂ انساب نے علقمہ بن فراس کو "جذل الطعان" کا لقب دیا ہے، اگر یہ لقب اس کے خاندان میں عام ہو جائے تو ہر ایک فرد "جذل الطعان" ہوسکتا ہے، شاید اسی بنا پر "عمرؔو" یا "عُمیر" کو یہ لقب دیا گیا ہو، ورنہ دراصل یہ انکے جد کا لقب ہے،

۱۴- ص ۱۲ "قیل انہ للشویعر ربیعۃ بن عبس اللیثی" اس پر میمن صاحب نے کوئی حاشیہ نہیں لکھا، حالانکہ یہاں بحث کی بہت کچھ گنجایش تھی، آمدی نے "المختلف و المؤتلف" ص ۱۴۲ پر "شویعر کنانی کا نام ربیعہ بن عثمان" لکھا ہے، الجاحظ البیان کے جلد ۲ ص ۲۳ پر لکھتا ہے، الشویعر ایضا صفوان بن عبد یالیل من بنی سعد بن لیث، یقال ان اسمہ ربیعۃ بن عثمان" اغانی جلد ۱۹ ص ۱۸ میں البکری کی طرح "الشویعر اللیثی" کا نام ربیعہ لکھا ہے، مگر وہاں "عبس" کی جگہ "علس" طبع ہوگیا ہے، الغرض یہ چیز لائق

تحقیق تھی جسے میمن صاحب طرح دے گئے!

۱۵- ص ۱۲ "امیۃ بن العسکر" کے نسب میں "عبداللہ بن سرابیل الموت" لکھا ہے، جو غلط ہے، عبداللہ خود "سربال الموت" سے ملقب تھا، "سرابیل الموت" اگرچہ طبقات ابن سلام جمحی وغیرہ میں اسی طرح ہے مگر یہ صحیح نہیں دیکھو "اکمال ابن ماکولا" و کتب انساب،

۱۶- ص ۱۳ "وزعم ابوزید انہ جاھلیٌ" قتال کلابی کی بابت یہ خیال ابوزید نے کس کتاب میں ظاہر کیا ہے، اس کا حوالہ اگر میمن صاحب بتا سکیں تو اسکی ضرورت ہے!

۱۷- ص ۱۵ "انّ ابغضَ الرّجال الی اللہ الخصمُ الالدّ" حدیث سفیان ص ۱۴ وغیرہ کی تخریج کی طرح حسب دستور اسکی تخریج بھی میمنی صاحب چھوڑ گئے، ایسے مقام پر جہاں شارح پر ایک صحیح نقد وارد ہوتا ہے، اغماض سے کام لیا جاتا ہے، یہ روایت صحیحین میں مختلف طریقوں سے ہے، بعض میں "ابغضُ الرّجال" اور بعض میں "اِنّ ابغضَ الرّجالِ الی اللہ الالدّ الخصِمُ" ہے جیسا کہ مسلم کے الفاظ ہیں بکری کا "الخصم الالدّ" لکھنا سبق قلم ہے!

۱۸- ص ۱۵ حدیث "مَن خاصم فجر، ومن فجر کفر" کی تخریج سے میمن صاحب نے حسب دستور اغماض کیا ہے، میرے نزدیک یہ روایت موضوعات میں سے معلوم ہوتی ہے، واللہ اعلمُ،

۱۹- ص ۱۷، قولہ:- قَدْ انتصر ابوحیان التوحیدی لھذا القول الذی اعترف الجاحظ بخطائہ فیہ" یہ تمام تطویل لغو اور فضول ہے، دنیا کی کسی زبان میں فصحاء کے یہاں کسی وقت فاضل و بالغ سے اغلاط پسند نہیں کئے جاتے، کچھ توتلاپن اور ایسے ہی بعض اغلاط بچپن میں مستحسن سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی از قبیل ندرت، سنِ بلوغ کے بعد کسی قسم کے لحن یا غلط کا استحسان کسی عاقل کے یہاں نہیں ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے، جاحظ کا اقرار کمالِ معرفت پر دال ہے، اور لوگوں کا حیلہ سفاہت و جرأت سے زیادہ نہیں!

۲۰۔ ص ۱۷۔ "کلامه فی الملاحن متردد بین المعنیین" یہ خواہ مخواہ ابن دُرید پر افتراء ہے، "الملاحن" طبع یورپ کے ص ۴ پر ان کا کلام بالکل صاف ہے، "یرید انها تعرض فی کلامها وحدیثها فتزیله عن جهته فجعل ذلك لحنا" اسی کو القالی نے ص ۶ پر ذرہ فرق سے اس طرح نقل کیا ہے، "یرید تعوص" "تعرض" کی جگہ فتزیله عن جهته لیلا یفهمه الحاضرون ثم قال "وخیر الحدیث ما کان لحنا" ای خیر الحدیث ما فهمه صاحبك الذی تحب افهامه وحده وخفی علی غیره اس واضح بیان کے بعد تردد کا خیال "المعنی فی بطن الشاعر" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا!

۲۱۔ ص ۲۱۔ ابنی مالك بن حنظلة قال وابنا مالك یا مرکران تنذرهم یہاں میمن صاحب چکرا گئے ہیں، حاشیہ پر "کذا بلفظ الجمع عند الجمیع" لکھ کر اپنی تحقیق کے سمند کو چھوڑ بھاگے ہیں، اور کمال فن وصناعة کی شہادت اچھی طرح دی ہے، الجمیع میں معلوم نہیں کون کون لوگ ہیں اگر عقد الفرید ملاحظہ فرماتے تو یہ "کذا" کا فضول ولغو کلمہ زبان وقلم سے نہ نکلتا، صحیح "بنی مالک" ہے، اسی طرح "ابناء مالک" نہ "ابنا مالک"

اذا ضیعت اول کل امر | ابت اعجازه الا التواء

۲۲۔ ص ۲۱۔ یوم الوقیط کی بابت لکھا ہے، "کان فی فتنة عثمان" ج ۳ صفحہ ۸ والعمدہ ۲ صفحہ ۱۶۷ اکثر لوگوں کا یہی خیال ہوگا، مگر میرے نزدیک یہ محل بحث ونظر ہے، کیونکہ اس جنگ میں ابجر بن جابر رئیس شریک تھا، جو اسلام سے قبل مرچکا تھا، اس کا بیٹا حجار بن ابجر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمان ہوا، نیز اس جنگ میں جن لوگوں کا ذکر آیا ہے، وہ اکثر جاہلیت میں مرچکے تھے، کسی کا زمانۂ اسلام میں پتہ نہیں چلتا، اگر یہ لوگ مسلمان ہوتے تو صحابہ میں ان کا ذکر ہوتا، عقد الفرید وغیرہ میں حکیم نہشلی کا اس واقعہ میں شریک ہونا، قتل ہونا، اور یہ شعر پڑھنا مذکور ہے،

کل امری مصبح فی اهله | والموت ادنی من شراك نعله

صحیحین میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہجرت کے بعد یہ شعر پڑھنا مذکور ہے، نیز عنترہ کا اس واقعہ کی بابت یہ کہنا آخری فیصلہ ہے، کہ یہ واقعہ جاہلیة کا ہے!

وغادرنا حکیما فی مجال | صریعا قد سلبناه الازارا

۲۳۔ ص ۲۱۔ "الدهنا" کی بابت کامل مبرد سے مقصور لکھکر میمن صاحب لکھتے ہیں "قال العاجز وجدته انا ممدودا فی قول ابی زبید "ما اطاف المبس بالدهناء"

الدهنا مقصور وممدود دونوں طرح ائمہ لغت نے لکھا ہے، محض اس شعر سے عاجز کا استدلال صحیح نہیں، کیونکہ اس میں صحیح روایت "بالدهماء" ہے، نہ "بالدهناء" اس کے واسطے الجمہرہ وغیرہ ملاحظہ ہو،

۲۴۔ ص ۲۲ فصبحت الهما زم من بنی بکر بن حنظلة میں شارح کے لفظ "بنی بکر" پر میمن صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے، کہ لهازم قیس تیم اللہ عجل اور عنزہ چاروں ہیں، عنزہ بکر سے نہیں ہے باقی ہیں، اس لئے اس موقع پر "بنی بکر" صحیح نہیں، یہ ایک معمولی بے معنی سی بات ہے، زیادہ جماعت بنی بکر کی تھی، اور وہی میدان حرب میں قوت عاملہ تھی، اسلئے تغلیبا انھیں ذکر کرنا کوئی قابل اعتراض نہیں ہے

۲۵۔ ص ۲۲ لیس فی قولهم "ان العرفج قد ادبی دلیل علی ما ذکره ابو علی عن الحرب" الخ اس جگہ شارح نے ابو علی اور ان کے شیوخ پر نہایت مفید نقد کیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ ادبی العرفج وغیرہ دشمنوں کی تیاری کا کنایہ ہے، نہ یہ کہ وہ حقیقةً ہتھیار بند ہوگئے تھے، جیسا ان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کلام طرز بیان پر ہے، اس پر شارح نے بہت اچھی گفتگو کی ہے، ابو علی کی غلط حمایت کوئی مفید نہیں

۲۶۔ ص ۲۳۔ "لو وصل الغیث" الخ ان ابیات کو ابن قتیبہ نے الشعراء کے ص ۲۵ یورپ میں ذکر کیا ہے، جب "ابنین" صحیح ہے، تو "ابنیا" بنانے کی چنداں ضرورت نہیں!

۲۷۔ ص ۲۴ "یا ابن هشام" الخ اس شعر کو ابن درید نے الجمہرہ جلد ۲ ص ۴۰۸ وغیرہ میں کئی جگہ لکھا ہے، اور روایت مشہورہ "بقوس وقرن" ہے،

۲۸۔ ص ۲۶ شارح نے لکھا ہے "ومن ھٰذا اللحن مارواہ غیر واحد" الخ اس پر میمن صاحب لکھتے ہیں، "کما فی الا ذکیا" تعجب ہے کہ انھیں دوسری جگہ تلاش کی ضرورت ہوئی، حالانکہ القالی جلد ۲ ص ۲۲۲ میں یہ پوری حکایت مذکور ہے،

۲۹۔ ص ۲۶ "وذکر اللیثی ان رجلا" الخ تعجب ہے کہ میمن صاحب اسکی تخریج سے کترا گئے، حالانکہ اس میں انھیں شارح پر قدرے نقد بھی ملتا، یہ قصہ الجاحظ نے جلد ۳ صفحہ ۱۲۶ پر دوسرے الفاظ کیساتھ نقل کیا ہے، غالباً شارح نے اپنی یاد سے اُسے نقل کیا ہے، اسی واسطے یہ غلطی سرزد ہوئی "زق خمر" کی جگہ وہاں "نحی صغیر فیہ سمن" ہے اور یہ پیغام بھیجا گیا تھا، "اخبرہ ان الشہر محاق وان جد ینا الذی کان یطالعنا وجدناہ ارثم نوما"

۳۰۔ ص ۲۶ "والرثم بیاض الشفۃ العلیا، ھٰذا اصلہ ثم استعمل فی الھتم" البکری نے اس جگہ ایک علمی غلطی کی ہے، جس کی طرف فاضل میمن صاحب کا ذہن نہیں پہونچ سکا، وہ تو ہمیشہ غلطی پکڑنے میں غلطی کرنا پسند کرتے ہیں، انھیں اصل اغلاط سے کیا سروکار؟

رَثم و رَثَم ثاء مثلثہ و مثناۃ دونوں کے معنی توڑنا بعضوں نے ناک اور منہ سے مخصوص کیا ہے، پھر اوپر کے ہونٹ کی سپیدی کے واسطے استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ یہ رنگ دوسرے رنگوں سے الگ ہوتا ہے، دراصل زخمی مقام کا رنگ سپیدی مائل ہوجاتا ہے، اس نسبت سے یہ استعمال کیا گیا:

پھر البکری کا یہ کہنا "الرثم ھو الھتم" ائمہ لغت کے نزدیک صحیح نہیں کیونکہ "رثم" اور "ہتم" میں بڑا فرق ہے، "ہتم" صرف دانتوں کے توڑنے کے واسطے خصوصاً اگلے دانتوں کے واسطے آتا ہے، "رثم" اسے ہرگز نہیں کہتے!

۳۱۔ ص ۲۶ "السحیم مصغراً سحم بمعنی الاسود، وھو علم لکثیر من سودان العجم" کے

متعلق یہ کہنا کہ بہت سے کالوں کا علم ہے صحیح نہیں بلکہ بہت سے آدمیوں کا علم ہے جنہیں کالے بھی ہوں گے، دراصل اسحم ہر ایک سیاہ چیز کو کہتے ہیں، خواہ وہ پہاڑ ہو، مشک ہو، رات ہو، بادل ہو، یہ استعمال کلام عرب میں معروف ہے!

۳۲۔ ص ۲۹ جمیل بن معمر کے نسب میں اختلاف بتاکر پھر نہایت غلط اور محرف نسب لکھا ہے، یا اصل کو چھوڑ دیتے، یا جہانتک ممکن تھا تصحیح کرکے لکھتے، جبر، قیس بن جزر، ضبہ، کثیر، سعد بن ہذیم، معمر بن صباح، یہ تمام تحریفات و تصحیفات ہیں جنھیں متفرق کتابوں سے بغیر سوچے سمجھے نقل کرلیا گیا ہے، ان تمام اغلاط کی صحت ملاحظہ فرمائیے،

الف:۔ "جبر" یہ "خیبری" کی تصحیف ہے، جیسا کہ ابن ماکولا وغیرہ نے اسے صحیح طور پر ضبط کیا ہے،

ب:۔ "قیس بن جزر" ایجاد کردہ نام اور محض تحریف ہے، صحیح "خنبس" یا "سنبس بن حن" ہے، جیسا کہ الاکمال ابن ماکولا وغیرہ میں ہے،

ج:۔ "ضبۃ" مصحف ہے، صحیح "ضنۃ" بالنون وکسر الضاد ہے، اسکے واسطے الاشتقاق ابن درید اور ابن ماکولا وغیرہ ملاحظہ ہو،

د:۔ "کثیر" نام کا اس نسب نامہ میں کوئی شخص نہیں، یہ لفظ "کبیر" بالباء الموحدہ ہے،

ھ:۔ "سعد بن ہذیم" کسی جگہ نہیں، یہ خاص فاضل میمن کی صناعت ہے، ورنہ سب جگہ سعد ہذیم بغیر لفظ "ابن" ہے،

و:۔ "معمر بن صباح" صحیح نہیں، "صباح" عبد اللہ کا لقب ہے،

ز:۔ "ظبیان" نہیں، "ظبیان" بکسر ظاء ہے، جیسا ابن ماکولا وغیرہ نے تصریح کی ہے،

اب ہم صحیح نسب ابن الکلبی وغیرہ کی روایت سے جسے حافظ ابن حزم نے جمہرۃ الانساب میں لکھا ہے، اور امیر ابن ماکولا نے جابجا اسے ضبط کیا ہے، درج کرتے ہیں "جمیل بن عبد اللہ بن معمر

ابن الحرث بن خیبری بن ظبیان، وھو سنبس (خنبس ؟) ابن حُیّ بن ربیعہ بن حرام ابن ضِنّۃ (بالنون وکسر الضاد) ابن عبد بن کبیر، (بالباء) ابن عُذرۃ بن سعد ھُذیم بن زید بن لیث بن سُود بن اَسلَم (بضم اللام) ابن الحاف بن قضاعہ!

عبد اللہ کو صباح کہتے ہیں، جیسا اغانی وغیرہ میں ہے، کبھی ابن قمیۃ بھی کہتے ہیں، قمیۃ دراصل عبد اللہ کے باپ معمر کی ماں ہے، جسکی طرف جمیل یا عبد اللہ منسوب ہوتے ہیں!

۳۲۔ ص ۳۰، الجمیح الاسدی شاعر کے نسب میں دو فاحش اغلاط ہیں،

ایک:۔ "طَریف" بفتح طاء کو "طُریف" مصغراً ضبط کیا ہے،

دوم:۔ "قُعین" کے بعد طُریف کے نسب میں اضافہ کیا گیا ہے، صحیح "قعین بن الحرث بن ثعلبہ" ہے جیسا کہ ائمہ نسب کا اس پر اتفاق ہے!

(باقی)

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابوں میں مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیمگاہوں کا حال معلوم کرنا چاہیں، تو نہیں مل سکتا، مولوی ابوالحسنات صاحب مرحوم نے نہایت تحقیق و تلاش کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ مرتب کیا تھا، جسکو اہل نظر نے بیحد پسند کیا، اب دار المصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت میں نہایت اہتمام کیساتھ شائع کیا ہے، ضخامت ۱۲۴ صفحات قیمت ۱۲ر

مقالات شبلی حصہ سوم

مولینا شبلی مرحوم کے تعلیمی مضامین کا مجموعہ، ضخامت ،، ،، صفحے، قیمت :- عہ

"منیجر"

ایساغوجی

از

جناب ایم اے حفیظ صاحب، پٹنہ،

فن منطق میں اس نام کا رسالہ صدیوں سے عربی درسگاہوں میں متداول رہا ہے، اس کے مؤلف اثیر الدین ابہری نے سنہ ۶۶۳ھ میں وفات پائی، اور پہلی شرح اس پر حسام الدین حسن الکافی المتوفی ...ھ نے لکھی، بعد ازاں یہ شارحین و حاشیہ نویسوں کا بازیچہ بن گیا،

بعضوں نے رسالہ کے نام ایساغوجی پر بھی روشنی ڈالی ہے،

مرأۃ المنطق میں جو ہندوستان میں سنہ ۱۲۴۴ھ کے بعد لکھی گئی ہے اور اکثر منطق کے مجموعوں میں پائی جاتی ہے، مؤلف کہتا ہے کہ میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا، مگر استادوں کی زبانی سنا ہے، کہ ایساغوجی ایک یونانی لفظ ہے، اور اس کے معنی میں اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک قسم کا گلاب ہے جسمیں پانچ پنکھڑیاں ہوتی ہیں، بعض کے نزدیک یہ تین جدا لفظوں سے مرکب ہے، ایس، اغو، جی، جن کے معنی ہیں؛ تو، میں، وہ، پہلی شرح تو ایک شاعرانہ خیال ہے، اور باعتبار موضوع رسالہ ایسی ناموزوں بھی نہیں، دوسری شرح میں علاوہ اس امر کے کہ یونانی زبان میں لفظ اگو بیشک واحد متکلم ہے، مگر بقیہ اجزا، ایس و جی[1] مندرجہ بالا معنوں میں نہیں پائے جاتے، ان ضمیروں کو فن منطق یا اس کے کسی حصہ سے بظاہر کوئی خاص تعلق نہیں،

[1] ایس، صد، جی، ارض،

قال اقول میں سید السند میر شریف کہتے ہیں کہ یونان میں اسی نام کا ایک حکیم گذرا ہے جس کی طرف کلیات خمس منسوب ہے، لیکن شارحین عموماً اس لفظ کو کلیات خمس کا مترادف بتاتے ہیں کشف الظنون[1] میں فارسی کا ایک شعر منقول ہے،

جنس و فصل و نوع و خاصہ عرض عام — جملہ را ایساغوجی کردند نام

ذیل کی سطروں میں اس لفظ کے اصلی مفہوم اور منطق کی تاریخ میں اس کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کیجائے گی وباللہ التوفیق۔

حکیم فرفوریوس کے نام سے حکمائے اسلام اور چند صوفیائے کرام بخوبی واقف تھے حکمت اشراق و حکمت مشائی میں اس نے معرکۃ الآراء تصنیفیں چھوڑی ہیں، جو یونانی سے عربی میں ترجمہ ہو کر ان تک پہونچیں، ہندوستان میں عبد العلی بحر العلوم جو دونوں حکمتوں کے جامع اور ہر ایک کے متبحر تھے اپنی شرح مثنوی مولینا روم اور شرح میرزاہد ملا جلال میں جا بجا اس کا حوالہ دیتے ہیں،

یہ حکیم[2] ۲۳۳ء میں ملک شام کے شہر طرابلس میں پیدا ہوا، قیصریہ اور اتھینیہ (ایتھنز) میں تعلیم پائی، اصلی نام ملکوس تھا، جو لاطینی بھیس میں لفظ ملک ہے، اس نام کے لحاظ سے اور اس مناسبت سے بھی، کہ وہ اکثر بیگنی رنگ کا لباس پہنا کرتا تھا، جس رنگ کا قیاصرۂ روم کا درباری جبہ ہوا کرتا تھا، اس کے استاد نے اس کو پورفاریس یعنی بیگنی لباس والے کا لقب دیا اور وہ اسی لقب سے مشہور ہوا، اس کے عہد میں روم (رومۃ الکبریٰ) کے حکیم فلوطینس کی شہرت عالم گیر تھی، اس سے شرف

[1] کشف الظنون جلد اول ص ۵۰۲،

[2] فرفوریوس و فلوطینس کے حالات انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا و بالڈون، ڈکشنری آف فلاسفی وغیرہ میں ہیں، نیز شہرستانی کتاب الملل والنحل جلد ۲ صفحہ ۲۳۲ و ۲۳۵ میں فرفوریوس کا فلسفہ جو درحقیقت اس کے استاد کا فلسفہ ہے، اور بنام شیخ الیونانی آخر الذکر کے رموز وامثال درج ہیں،

تلمذ حاصل کرنے کے لئے یہ علم کا پیاسا روم پہونچا، اور چھ سال تک اس کے حلقۂ درس میں شامل رہا، پھر جزیرہ صقلیہ میں پانچ برس گذار کر روم واپس آکر خود فلسفہ کا درس دینا شروع کیا، اور اپنے استاد فلوطینس کے فلسفہ کی توضیح و ترویج میں سرگرم رہنے لگا، اسی اثنا میں ایک سات بچوں والی بیوہ مرسلا نامی سے شادی بھی کر لی، جو اسی کی طرح فلسفہ کی بڑی دلدادہ تھی، فرفوریوس قریب ستر برس کی عمر پا کر فوت ہوا،

اس نے بہت سی تصنیفیں چھوڑیں، مگر ان میں سے زیادہ تر آج ناپید ہیں، یہاں پر صرف تین قابل ذکر ہیں،

۱۔ ایڈورسس کرسٹی اینوس یعنی الرد علی النصاریٰ جو غالباً اس کی سب سے زیادہ اہم تصنیف تھی، وہ مسیحیت کا سخت دشمن اور یونانی بت پرستی کا بڑا حامی تھا،

۲۔ استاد کی سوانح عمری اور اس کی تعلیمات کی شرح، فلوطینس بظاہر اپنی قومی بت پرستی پر ثابت قدم تھا، مگر وہ ایک خاص عقیدہ کا بانی بھی گذرا ہے، جو بعد کو مسیحیت اور اسلام کے کئی فرقوں میں سرایت کر گیا، وہ کہتا ہے، کہ ذات باری تعالیٰ مادہ سے اس قدر پاک اور برتر ہے، کہ کون کا اس سے براہ راست ظہور پانا عقلاً محال ہے، اس نے عقل کل پیدا کی جس سے بتوسط یکے بعد دیگرے نفس کل، طبیعت، ہیولیٰ، صورت اور جسم وجود میں آئے، فتوحات مکیہ میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے نفس کل و عقل کل کو لوح و قلم سے تعبیر کر کے اس عقیدہ کو صوفیائے کرام کے اس گروہ میں رواج دیا، جو وحدت الوجود کا بھی قائل تھا، اگرچہ ان دونوں عقیدوں میں کسی طرح کا لگاؤ نہیں، کچھ عرصہ ہوا، کہ انگلستان کے مشہور فیلسوف ورکن کلید ڈین انگ نے فلوطینس کی تعلیمات پر ایک مبسوط تصنیف شائع کی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اگر اس سے متفق نہیں تو اسکے مخالف بھی نہیں،

۳۔ ایساغوجی و شرح قاطیغوریاس ارسطو بسبب تالیف ایساغوجی یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ

کہ ایک امیر زادہ، کرائی ساورس نے جو فرفوریوس کے شاگردوں میں سے تھا، اپنے استاد سے درخواست کی
کہ کوہ آتش فشاں کی تاریخ مرتب کرنے کی فرمایش کی، جس کی تعمیل کے لئے فرفوریوس جزیرہ صقلیہ
گیا جہاں اٹینا واقع ہے، اس اثنا میں امیر زادہ کو ارسطو کی تصنیف قاطیغوریاس (مقولات عشر)
کہیں سے ہاتھ لگی، جب وہ اس کے مطالب کو نہ سمجھ سکا، تو اس نے اپنے استاد کو خط لکھا کہ اگر
تاریخ اٹینا اختتام کو پہونچ گئی ہو تو روم واپس چلے آئیے ورنہ قاطیغوریاس پر ایک ایسا مضمون تحریر
کیجئے کہ اس کے مطالعہ سے اصل کتاب کا مفہوم بآسانی ذہن نشین ہو جائے چونکہ فرفوریوس اس
وقت روم واپس نہ جا سکتا تھا، اس نے ایساغوجی تصنیف کر کے امیر زادہ کے پاس بھیجدی[1] یہ لفظ
مرکب ہے، دو یونانی لفظوں سے جس کے معنی ہیں وہ شے جو کسی دوسری شے کی طرف رہبری کرے لیکن
پر اس نام سے وہ رسالہ مراد ہے، جو ارسطو کی تصنیف قاطیغوریاس کے واسطے دلیل، ہادی اور رہبر کا کام
دینے کو فرفوریوس نے مرتب کیا تھا،

ابتدا میں جب یونانی کتابیں عربی زبان میں منتقل ہونے لگیں، تو یہ رسالہ بھی ترجمہ ہوا،
مترجموں نے ایساغوجی کا ترجمہ مدخل کیا، چنانچہ کتاب الفہرست ابن ندیم[2] میں پورا نام یوں
مذکور ہے،

کتاب ایساغوجی فی المدخل الی الکتب المنطقیہ،

بعضوں نے اس کی تلخیص کی، یا شرحیں ترتیب دیں، جن کا مجمل بیان کشف الظنون وغیرہ میں ملیگا
کتب خانہ برٹش میوزیم واقع لندن میں عربی زبان کا ایک قلمی نسخہ[3] محفوظ ہے، جس کے شروع کے چند

---

[1] ترجمہ انگریزی ارغنون ارسطو از ٹامس ٹیلر مطبوعہ لندن ۱۸۱۲ء اس کمیاب تالیف کا ایک مکمل نسخہ امپیریل لائبریری کلکتہ میں موجود ہے، مترجم کا حال ڈکشنری آف نیشنل بائگرفی میں درج ہے،
[2] ص ۲۳۵، [3] ضمیمہ فہرست کتب قلمی عربی ص ۹۲ نسخہ نمبر ۱۱،

اوراق ضائع ہو گئے ہیں، اور مؤلف کے نام کا پتہ نہیں، مگر مقدمہ میں اس نے تصنیف فرفوریوس کا
کا نام اور اس کی غرض و غایت ذیل کی عبارت میں بیان کی ہے:-

"فاما اسمہ فالمدخل اذ کان غرضی فیہ ان یتعلمنا عن اشیاء تسہل لنا فہم
ما فی قاطیغوریاس والصناعۃ المنطقیہ، فہو اذن المدخل لہا۔ فاما مرتبتہ
فیجب ان یقرأ قبل قاطیغوریاس اذ کان مدخلا و مسہلا لاشیاء
مستصعبۃ فیہا، فاما واضعہ ففرفوریوس وذلک نمط کلامہ ومن شہد
المفسرین الموثوق بہم، واما من ای العلوم ہو، فمن المنطق اذ کان مدخلا
الی الصنائع المنطقیہ

اور یہی نام رسالہ کے اخیر میں بھی پایا جاتا ہے،

وھھنا یقطع فرفوریوس الکلام فی المدخل

یہ لفظ اس زمانہ کی دوسری کتابوں کے نام کے ساتھ بھی ملتا ہے، مثلاً المدخل الی القیاسات
المدخل الی صناعۃ النجوم، بعد کو جب اصطلاحیں وضع ہونے لگیں، تو اس طرح کی مختصر تالیفات
یا کتابوں کے ابتدائی حصوں کا نام مقدمہ پڑا پھر یہ دو قسموں پر منقسم ہوا، ایک مقدمۃ الکتاب یعنی کسی
کتاب کا ایسا ابتدائی حصہ جو اس کتاب کے مطالب دریافت کرنے میں معین و مددگار ہو، دوسرا مقدمۃ
العلم یعنی ان مسائل کی تفصیل و توضیح جن پر کسی علم کا دار و مدار ہو، ظاہر ہے کہ ایساغوجی پہلی قسم سے ہے،
اسی لئے منطق کے نو بابوں میں پہلا باب اس کا قرار پایا ہے، پھر مقولات عشر، قضایا، تعریفات وغیرہ
جو خود ارسطو کی تصنیفات میں سے ہیں، اس سلسلہ میں یہ رسالہ قرون وسطیٰ کے یورپ میں لاطینی زبان
میں ترجمہ ہو کر مدتوں داخل درس اور علما میں زیر بحث رہا،

فلسفہ کی تاریخ میں اس رسالہ کی اہمیت کے دو اسباب ہیں،

۱- ارسطو کے بعد منطق میں چند ایسی بحثیں تخلیط پا گئی تھیں، جن کا تعلق منطق سے زیادہ فلسفۂ الٰہیات[1] کو ہے۔ فرفوریوس اس الزام سے بری ہے، کیونکہ وہ ایساغوجی فصل اول میں لکھتا ہے، کہ میں اس رسالہ میں صرف سہل مسائل پر بحث کروں گا، اور ان مسائل سے احتراز کروں گا، جو دقیق ہیں، مثلاً یہ کہ اجناس و انواع محض ذہن میں وجود رکھتے ہیں یا خارج میں بھی اور اگر خارج میں بھی وجود رکھتے ہیں، تو اجسام ہیں یا غیر اجسام اور یہ کہ محسوسات میں ہیں یا محسوسات سے جدا کیونکہ ان مسائل کیلئے ایک مستقل تصنیف کی حاجت ہے۔

۲- ارسطو کہتا ہے، کہ ایک معمولی قضیہ موجبہ کلیہ پر غور کرو، مثلاً یہ کہ کل ب ج ہیں، اگر یہ قضیہ صادق ہے، تو ممکن ہے کہ اس کا عکس کل ج ب بھی صادق ہو یا نہ ہو، اگر صادق ہے تو موضوع و محمول تساوی ہوئے، انکی صرف دو صورتیں ہیں، اگر محمول موضوع کی عین ماہیت بیان کرتا ہے، تو وہ موضوع کا معرّف ہوا، ورنہ خاصّہ اگر کل ب ج صادق ہے، اور کل ج ب کاذب تو محمول موضوع کے معرف کا کوئی جزء ہو یا نہ ہو، اگر اس کا ایک جزو ہے، تو محمول جنس ہوگا یا فصل، اگر محمول موضوع کے معرف کا کوئی جزو نہیں ہے تو یہ عرض عام ہے یعنی ایک ایسی شے ہے، جو موضوع و غیر موضوع میں مشترک ہے قضیہ مذکور کی ان صورتوں کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہوسکتی یعنی یہ تقسیم جامع و مانع ہے پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی قضیہ موجبہ کلیہ کا محمول موضوع کا خواہ معرف ہے خواہ خاصہ جنس فصل عرض عام میں سے ایک۔ ارسطو کی اس تقسیم قضایا کو فرفوریوس نے یوں ترمیم کیا، کہ پہلے تو معرف کو خارج کردیا، اس لئے کہ یہ مرکب ہی جنس و فصل سے ہے پھر قضیہ تعریف کے موضوع کا نام نوع رکھکر کلیات خمس کو پورا کردیا، اور اس کو بجائے تقسیم قضایا کے بالعموم تصورات کی تقسیم قرار دی، اس بحث کو فرفوریوس نے جس قالب میں سولہ سو برس پیشتر ڈھالا تھا، اسی قالب میں یہ آجتک ہر جگہ جہاں منطق کا درس ہوتا ہے،

[1] الٰہیات سے یہاں مراد ہے فلسفۂ الاولیٰ جو بعد کو مابعد الطبیعیہ میٹا فزکس کہلایا کیونکہ اسکی تعلیم طبعیات کے بعد ہوا کرتی تھی،

خواہ مدرسہ ہو خواہ کالج، طلبہ کے آگے پیش کیجاتی ہے،

یہاں پر ایک دوسری غلط فہمی کی طرف اشارہ خلاف موقع نہ ہوگا، شارحین کہتے ہیں معلوم نہیں ان کا ماخذ کیا ہے، کہ اسکندر کی فرمایش سے ارسطو نے فنِ منطق[2] مدون کیا، اور اس کے صلہ میں اس کو ایک کثیر رقم ملی، اس سبب سے منطق کو میراث ذوالقرنین کہا گیا ہے، مگر اس بیان کی یونانی تواریخ میں کوئی شہادت نہیں پائی جاتی، یہ مسلّم ہے، کہ ارسطو تین سال تک اسکندر کا معلم رہا، لیکن اس نے شباب ہی میں جہان کشائی کے لئے وطن ایسا چھوڑا، کہ پھر اس کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا، مزید بران فتحِ ایران کے ایام میں ارسطو کے ایک عزیز کلستھینز نامی نے جب اس کی عبادت حسب معمول اہل ایران کرنے سے انکار کیا، تو وہ ایسا چراغ پا ہوا کہ اپنے قدیم استاد سے اس کا بدلہ لینے سے دھمکی دی، اور اس کو اپنے سابق شاگرد کی قلمرو سے فرار ہونا پڑا،

علاوہ ازین ارسطو خود کہتا ہے، کہ منطق کی ابتدا جدلیات، ڈائیلکٹیکا سے ہوئی، اور اس کا واضع زینون اکبر تھا، پھر سوفسطائی (فلسفہ فروش) اس فن کو اپنے مصرف میں لائے، فلاطون نے اس کو فلسفہ تہذیب الاخلاق (ایتھکس) سے جدا کرکے اس کے بہت سے مسائل پر بحثیں کیں، اخیر میں ارسطو نے قدما کے اقوال کی ایسی با اصول اور جامع تدوین کی، کہ اس کو اگر منطق کا واضع بھی کہا جائے، تو ایسا بیجا نہیں، بعد کو اس پر دو اضافے ہوئے، اس کے شاگرد تھیو فراسٹس نے قضایاے شرطیہ کا بیان شامل کیا، شکلِ رابع کو ارسطو نے شاید ناقص سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، اس کا اضافہ جالینوس کی طرف منسوب ہے،

منطق ارسطاطالیسی کا موازنہ قدیم ہندوؤں کی منطق سے کرنے سے فوراً تخم و پوست کا

[2] لاجک لوگوس سے اور منطق نطق سے مشتق ہے، اور دونوں لفظ ہم معنی ہیں، ارسطو کے یہاں اس فن کا نام انالیٹیکا ہے،

فرق ظاہر ہو جائے گا، سنسکرت میں اس فن کو نہایا[1] کہتے ہیں، قیاس بتکرار صغریٰ و نتیجہ پانچ قضیون پر بہ تفصیل ذیل مشتمل ہے،

مدعا :- اس پہاڑ میں آگ ہے،

سبب :- کیونکہ اس سے دھوان نکلتا ہے،

قاعدہ :- جس شے سے دھواں نکلے اس میں آگ ہوتی ہے،

اطلاق :- اس پہاڑ سے دھواں نکلتا ہے،

نتیجہ :- اس پہاڑ میں آگ ہے،

منطق کی بہتوں نے مخالفت کی ہے، جن میں لوتھر و بیکن یورپ میں اور امام غزالی اور شارحین کے امام زاعم، رازی مسلمانوں میں نامور گذرے ہیں، عارف جامی نے دو بیتوں پر اکتفا کی ہے،

زمنطق مکن نطق کاندر و گیتی — نہ حل شد ز اشکالِ او ہیچ مشکل

مبیں نگشت از حدود و رسومش — نہ اجناسِ عالی نہ انواعِ سافل

[1] آئین اکبری ص ۲، ہندو لاجک مطبوعہ کلکتہ یونیورسٹی،

اکبری دور کا ایک موجد

شاہ فتح اللہ شیرازی

از جناب معین الدین صاحب ہبر فاروقی (منشی فاضل)،

تعجب ہو کہ، شیراز کی مردم خیز خاک سے ایک باکمال اٹھتا ہے تو اس کی فضیلت کا غلغلہ شمال میں پھیلنے کی عوض جنوب کے آخری گوشہ دکن کو متحرک کرتا ہے، جہاں عادل شاہی خاندان بیجاپور کی سرزمین پر حکمرانی کیا کرتا تھا، اب یہ بات کوئی نئی نہیں رہی، کہ دکن کے سلاطین نے بھی علوم و فنون کی قدردانی، اور ارباب فضل کی سیادت میں بڑی بڑی شاہانہ فیاضیان دکھلائیں، اور بے انتہا قدردانیان کیں، چنانچہ مورخ فرشتہ لکھتا ہے، کہ "تاج دار بیجاپور نے ہزاروں منتوں اور سماجتوں کے ساتھ فرامین بھیجکر، لاکھوں روپیوں کے حاتمانہ صلے پیش کر کے شاہ فتح اللہ کو اپنے دربار میں آنے پر مجبور کیا"

اس سے پہلے کہ اس حکیم کا بیجاپوری دربار سے تعلق بیان کیا جائے اس کے ابتدائی حالات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن سخت افسوس کا مقام ہے کہ ایسی بے نظیر و باکمال شخصیت کے متعلق کسی نے بھی کچھ توجہ کا کام نہیں لیا، تلاش میں جتنی محنت کی، ناکامی رہی، اور جس قدر ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے، وہ اب آپکے مطالعہ کی نظر ہے،

نام فتح اللہ خطاب عضد الدولہ، وطن شیراز تھا، تاریخ بساتین السلاطین میں شاہ کمال الدین فتح اللہ بھی نام نظر پڑا[1] ان کے آباے کرام حسین زادے تھے، اور سیادت کا فخر رکھتے تھے، مولینا کمال الدین

[1] تاریخ بساتین السلاطین (بیجاپور) صفحہ ۲۴۲ مطبوعہ مطبع سیدی حیدرآباد دکن،

شروانی اور میر غیاث الدین منصور شیرازی کے سامنے طلب علم کے لئے زانوے ادب تہ کیا تھا، ابوالفضل نے اکبر نامہ میں ان کے اساتذہ میں ایک اور صاحب کا نام مولینا احمد بھی لکھا ہے[۱] ان بزرگواروں کے سوا انھوں نے خواجہ جمال الدین محمودؒ سے بھی تلمذ کا شرف حاصل کیا تھا، مولوی محمد حسین آزاد مرحوم نے ان کی شاگردی سے متعلق ایک خاص واقعہ لکھا ہے کہ

"ابتدا میں فن کے خیالات دل پر چھائے تھے، ضروریات علمی حاصل کرکے اہل عبادت اور گوشہ نشینوں کی خدمت میں حاضر رہنے لگے، اور اکثر میر شاہ مکنہ کی صحبت کو سعادت سمجھتے تھے، اس عرصہ میں اہل علم، اور صاحبان فضل کی تقریروں پر راغب ہوئے، اس لئے درس و تدریس کے حلقے میں داخل ہوئے، رفتہ رفتہ خواجہ جمال الدین محمود کے درس میں گئے، پہلے ہی دن حاشیہ میر پڑھنے بیٹھے، پڑھتے جاتے تھے اور خود بھی تقریر کرتے جاتے تھے، اس دن ایسے مطالب دقیق اور معانی لطیف ان سے ادا ہوئے، کہ حاضرین حیران رہ گئے، اس ملک میں دستور ہے کہ جب شاگرد سبق پڑھ چکتا ہے، تو اٹھ کر اپنے استاد کی خدمت میں تعظیم و تکریم بجالاتا ہے، انھوں نے چاہا کہ کھڑے ہوکر لوازم تعظیم ادا کریں، خواجہ نے سبقت کرکے خود سینہ پر ہاتھ رکھا، اور کہا کہ آج تم نے ہمیں مستفیض کیا، چنانچہ چند روز میں منتہی ہوکر خود علم کے پیاسوں کو سیراب کرنے لگے"[۲]

مورخین ان کے نام (فتح اللہ شیرازی) کے آگے کبھی، امیر، میر اور شاہ کے الفاظ زیادہ کرکے ذکر کیا کرتے ہیں، اور کبھی صرف خطاب عضد الدولہ پر اکتفا کیا ہے، جب مغلیہ دربار میں آئے، تو اکبر میر فتح اللہ کہنے لگا،[۳]

شاہ صاحب سلطنت بیجاپور میں آچکے تھے، اور عادل شاہ کی مہربانیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے، اور سلطان کمال درجہ ان کی عزت کیا کرتا تھا، ابراہیم عادل شاہ نے اپنے بیٹے علی عادل شاہ کی

۱ اکبر نامہ ابوالفضل مطبوعہ کلکتہ جلد سوم ص۴۰۱ ۔ ۲ دربار اکبری ص۶۷۳ مرتبہ محمد ابراہیم منصف امرتسر ۱۹۱۰ء ۳ دربار اکبری ص۶۷۹

تعلیم کے لئے ان کو مقرر کیا، شاہزادہ علی کی کم علمی کے واقعہ کو، اور شاہ فتح اللہ کا کیریکٹر واضح کرنے کے لئے تاریخ بساتین السلاطین سے اس کے مؤلف کے اصل الفاظ نقل کئے جاتے ہیں، اس سے قبل مختصر طور پر جان لینے کی ضرورت ہے، کہ ابراہیم عادل شاہ نے اپنے آبائی مذہب، امامیہ کو ترک کرکے تسنن اختیار کرلیا تھا لکھا ہے کہ

"شہزادہ علی در اوان طفلی، در زمان خوردی، بجدت فہم و شوخی طبع موصوف بود، و روز بروز چون بحد تمیز و سن رشد، نزدیک تر می شد، خصال شریفہ و اوصاف مرضیہ، بر دے ظہور آوردن گرفت، اما بہ سبب صحبت خواجہ عنایت اللہ شیرازی کہ بجہت تعلیم و تربیتش مامور بود، میل تمام بہ مذہب تشیع بہم رسانید، چنانچہ ابراہیم شاہ روزے در خلوت با خواص محرمان نشستہ بود، بتقریب ذکر مذہب و آئین جد و پدر، در میان آمد، فرمود شکر و سپاس معبود حقیقی راکہ مرا توفیق داد کہ از ملت و آئین جد و پدر بری گشتہ، دین قویم و صراط مستقیم کہ از سواد اعظم مذہب سنت جماعت است اختیار نمودم، و شعار روافض را برطرف ساختہ اثرے ازان نہ گذاشتم، دران وقت شاہزادہ حاضر بود، و این سخن بہ گوش می کرد، و از شوخ طبعی ضبط خود نہ نمودہ، گستاخانہ در برابر پدر گفت کہ اگر از طریقۂ جد و پدر گذشتن، روش محمود و طریق پسندیدہ است، ضرور شد کہ فرزندان آن حضرت چنیں کنند، ابراہیم شاہ ازین شوخی و ہم زبانی او برآشفت و پرسید کہ تو چہ مذہب داری، ؟ گفت بالفعل مذہب پادشاہ دارم آئندہ بر خدا اعلم است، پادشاہ دانست کہ شہزادہ شیعہ است و آن را از تاثیر صحبت استادش یقین کرد، عتاب آگین گشتہ چندروز بار سلام نہ داد و استادش حکم بہ حبس نمود، بعد ازان برائے تعلیم شہزادہ ملا فتح اللہ شیرازی را مقرر کرد، قضا را او ہم مذہب تشیع داشت، بملاحظۂ روزگار تقیہ را کار فرمودہ، خود را در مردم حنفی المذہب فرا می نمود، صحبت او با شہزادہ بہ موافقت انجامید، و شہزادہ بہ توقیر و تکریم افتخاری کوشید"[۱]

۱ تاریخ بیجاپور (بساتین السلاطین) ص۲۰۳

اس عبارت سے ظاہر ہے، کہ شاہ صاحب ابراہیم عادل شاہ اول (جلوس ۹۶۵ھ) کے عہد ہی میں بیجاپور آئے، اسی لئے تو وہ شاہزادہ علی کے استاد رہے، آزاد نے دربار اکبری میں ان کی آمد کے زمانہ کو علی عادل شاہ کا عہد بتایا ہے، جو درست نہیں معلوم ہوتا،[1]

بیجاپوری تاریخوں سے بھی ثابت ہوتا ہے، کہ انھوں نے علی عادل شاہ اول کے قتل کے بعد ۹۸۸ھ میں اس کے بھتیجے ابراہیم عادل شاہ ثانی کو تخت سلطنت دلانے میں بڑی کامیاب کوشش کی ابراہیم نے بھی ان کی کمال تکریم وقدردانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، مگر یہاں کے امراء کے جوڑ توڑ، ان کے نفاق عداوت، اور سلطنت کی ابتری کی وجہ سے وہ خوش نہ رہا کرتے تھے، اس دوران میں ان کے فضل وکمال کی شہرت، دکن سے نکل کر سارے ہندوستان میں گونج رہی تھی، چنانچہ دوسرے امرائے کے سوا جب فیضی دکن کا دورہ کرتا ہے، اور ان کی شہرت کی پیہم خبریں اسے ملتی ہیں، تو ان کے حالات بادشاہ کو لکھ بھیجتا ہے، اور دربار شاہی میں بلا لینے کی رائے دیتا ہے،

ادھر اکبر اہل کمال کا دلدادہ ہی نہیں، بلکہ بھوکا بیٹھا تھا، جب ان کے علم وفضل کے حالات نہایت کثرت سے سنے، تو ربیع الثانی ۹۹۰ھ میں عادل شاہ کے نام فرمان بھیجا، کہ اس یگانہ روزگار کو فوراً دربار شاہنشہی میں روانہ کردو، چنانچہ اکبر نامہ میں، ابوالفضل ۹۹۰ھ کے واقعات کے ذیل میں لکھتا ہے کہ

"درین ولا فرمان مقدس، بہ آمدن تذکرہ حکمائے پیشین امیر فتح اللہ شیرازی شرف نفاذ یافت، وبہ خواہش آن فرخ افزائے دانش، دیرین آرزوے او برآمد، از دیر باز بسیج قدسی آستاں داشت ورروزگار نیرنگ ساز یاوری نمی کرد، تا آنکہ بہ التماس عادل خاں، از شیراز بہ دکن آمد، وچوں روزگار او سپری شد، کمن اندیشہ نوی پذیرفت"،

گیتی خداوند، ازین آگہی، نشاط فرمود، بہ گوناگوں نوازش، ازان نگرانی برآورد، ومناشیر

---

[1] دربار اکبری ص ۶۷۳

مقدس، بہ مرزبانان دکن، واقطاع داران ممالک محروسہ نفاذ یافت کہ درسگالش آن سرآمد دودۂ آگہی، یاوری نمودہ رہبری نمایند وبہ گرم خوئی، ودل جوئی گوہر شناسائی بہ پایہ آورند"[1]

شاہ صاحب جب دارالسلطنت کے قریب پہونچے تو بادشاہ نے ان کے شایان شان عزت کی خاطر، خان خانان جیسے امیر کبیر اور ابوالفتح گیلانی ایسے اپنے ہر دل عزیز ندیم کو ان کے استقبال کیلئے بھیجا اس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ان کی عظمت کا بادشاہ کے دل پر اور لوگوں میں کیا اثر ہوگا، کہ سلطنت کے سب سے بڑے، اور چوٹی کے امیر کو بھیجا، ان لوگوں نے میر صاحب کو جا لیا، اور اپنے ہمراہ لیکر فتح پور میں بادشاہ کے حضور لاکر ملازمت کرائی، اکبر نے صدارت کے منصب سے سرفراز کرکے پرگنہ بہاور، بیداغ اور محلی جاگیر میں عطا کیے[2] ان کے اس ورود کی تاریخ کسی نے "شاہ فتح اللہ امام اولیا" کہی[3] ۹۹۰ھ

جب شاہ صاحب دربار میں پہنچ جاتے ہیں تو اہل دربار پر ان کی عظمت ورفعت کا جو سکہ بیٹھتا ہے، اسے بھی ابوالفضل کی زبان سے سنئے، اس کے ترجمے سے اس باکمال کی وقعت کم ہو جانے کا اندیشہ ہے، اور ممکن ہے کہ ترجمان کا طرز بیان اصل الفاظ کی قدر وقیمت کو ادا نہ کر سکے، لکھتا ہے:-

" واز سوانح آمدن امیر فتح اللہ شیرازی، در حکمت نظری وعلمی طراز یکتائی داشت، اگرچہ در دانش گاہ خواجہ جمال الدین محمود، ومولینا کمال الدین شروانی، ومولینا احمد کرد، فراواں شناسائی اندوخت لیکن پایۂ دانش از بیاں بلند تر نہاد، عادل خاں بیجاپوری بہ ہزاراں خواہش از شیراز بہ دکن آورد، پس از سپری شدن روزگار او، بہ حکم دیرین آرزو وفرمان طلب، بہ صوب قدسی آستان گام سعادت برگرفت، بست وپنجم ایں، دولت

---

[1] اکبر نامہ جلد سوم ص ۳۹۱ (کلکتہ)، [2] منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی، جلد دوم ص ۳۱۵ و ۳۱۶ (کلکتہ)، [3] ۵۳ ،،

والا دریافت، و شہنشاہِ حکمت پژوہ، بہ گوناگوں نوازش سربلندی بخشید . . . .

واز الفاف پژوہی با چنیں شگرف آگہی، در کم تر فرصتے، جویائے ارادتِ گیہاں خدیو، شد از

سعادت منشی کامیاب خواہش آمدہ بارہا در انجمن و نازش می کرد، اگر بہ خدمت ایں کثرت آرائے

وحدت گزیں" نہ می رسیدم راہے بہ ایزد شناسی نمی بردم، و راز خجستگی ذات دستر گی جوہرا

بادہ حکمت گوارا شد ز دانش رسمی، پردہ بر روئے حق پژوہی نہ ہشت . . . . . .

و امروز از فرخندگی روزگار، و بہ بیدار بختی مردم گیتی خداوند، پیشوائے نخستیں گروہ است، خوشا

روشن ستارہ کہ بدیں شناسائی جاوید سعادت اندوزد[1]

میر نے تھوڑے ہی عرصہ میں، اکبر کے مزاج میں بڑا رسوخ پیدا کر لیا، اور مصاحبت شاہی میں پایۂ قرب

منزلت بڑھا، سہ ہزاری منصب سے سرفراز ہوا[2]، اور مظفر خاں تربتی کی چھوٹی لڑکی سے شادی کرا دی، انتہائی وفاداری

خلوص اور شوق سے اپنے بادشاہ کی خدمت گذاری کی،

اکبری دربار کا مذہبی رنگ کچھ ایسا بگڑا کہ خدا کی پناہ، اسی لئے شہنشاہ سمجھتا تھا کہ میر فتح اللہ جو نئے

نئے آئے ہیں، دین فروش علمار کے ساتھ اس کی بیدینی کا ساتھ دینگے، کیونکہ وہ سنا کرتا تھا کہ شاہ صاحب

میر غیاث الدین منصور کے شاگرد ہیں، جو مذہب سے چنداں واسطہ نہ رکھتے تھے، لیکن شاہ فتح اللہ نے اُمراء پرستی

اور دنیا داری کے باوجود یہاں پہنچ کر عجیب جرأت دکھائی کہ عین دیوان خانۂ خاص میں جہاں کسی کا جگرنہ ہو سکتا

کہ علی الاعلان نماز پڑھ سکے، وہ انتہائی اطمینان اور فراغِ خاطر کے ساتھ، با جماعت امامیہ طریقہ پر نماز ادا کیا

کرتے تھے، اکبر ان دنوں لامذہبیت کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا، بڑے بڑے علمار کی داڑھیاں منڈوا

دی تھیں، اسلامی عبادات و مذہبی رسوم پر تمسخر کرتا اور لغو سمجھتا تھا، جبراً لوگ مذہب سے چھڑائے جاتے

تھے، مگر میر صاحب کے ان معاملات میں کیا مجال تھی کہ دخل دیتا، البتہ انکو ارباب تقلید سے سمجھتا تھا، انھوں نے

[1] اکبر نامہ جلد سوم ص۴۰۱ [2] مآثر الامرار جلد اول ص۱۰۱ مطبوعہ کلکتہ،

بھی جسارت کی حد کر دی تھی، اکبر کو چونکہ انکا پاس خاطر مقصود تھا اسی لئے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ چشم پوشی سے کام

لیتا تھا، لیکن اتنا ضرور، خاص طور سے ہوا کرتا کہ ہمیشہ ان کے سامنے مذہب اور اس کے اصول معتقدات کی

تذلیل بیربر وغیرہ کے ذریعے کیا کرتا تھا، یہ لوگ کھلم کھلا بادشاہ کی شہ پاکے "معراج" جیسے واقعات کو تکذیب

حلے کیا کرتے تھے، مگر شاہ صاحب نے ہمیشہ ان چیزوں کی بادشاہ کے سامنے کوئی تردید نہ کی، وہ ایک

باجبروت شہنشاہ کے سامنے اس قسم کے مباحث کی تائید و تردید کو خلاف مصلحت وقت سمجھتے اور امرائے

دربار کے رنگ کو دیکھ کر سہمے ہوئے تھے، جب کبھی ایسی صورتیں پیش آتیں تو سر جھکائے خاموشی سے سب

کچھ سنتے اور دربار سے نکل آتے تھے،

میر صاحب کے کمالات نجوم و رمل کی وجہ سے اکبر کے زائچہ کی تصحیح کی فرمائش کی گئی، اس لئے کہ ہندی

جوتشی اور یونانی نجومیوں نے الگ الگ اختلافات کے ساتھ اس کا زائچہ تیار کیا تھا، اور دونوں متفق

نہ ہوتے تھے، ان کے سامنے جب یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو انھوں نے اس وقت انتہائی فنی کمال کا اظہار کیا

اور ہر گروہ کو اس کی غلطی سے آگاہ کر کے اس کی تصحیح کی،

اکبر نامہ میں لکھا ہے:-

"در سالے کہ قدوۂ علمائے روزگار، و نقاوۂ دانش اندوزان، آموزگار قسطاس دقایق علوم

عقلیہ منالق مفہوم، مرتقی مدارج علیا، مبین حقائق اشیار، نقاد جواہر معنی حلال غوامض یونانی

پردہ شگاف روابط نور و ظلام، نکتہ طراز حرکت و سکون اجرام و اجسام عنقائے اوج بلند

پروازی علامۃ الدہر، عضد الدولہ، امیر فتح اللہ شیرازی، بہ رہ نمونی بخت بیدار، بہ پایۂ سریر

ارفع اعلیٰ مشرف شد و بہ مراتب رفیع، و مدارج عالی خلعت امتیاز یافت روزے راقم

ایں شگرف نامہ، مذکور ساخت، کہ زائچہ طالع مسعود، مختلف بہ نظر می رسید، مامول آن ست

کہ ایشان نیز، بہ تمودار صحیح غور تمام کردہ، بہ میزان تحقیق بسنجید، خدمت میر، از کمال تدقیق

"بہ ضوابط فارسی و قوانین یونانی استنباط طالع اشرف نمودہ اسد قرار دادند چون بہ اعتمادِ مجرد معتمد ترین زائچہ ہا صورت آں را با نمودجے، از احکام ایراد می نماید"[1]

شاہ صاحب کو دربار میں آئے ہوئے ابھی ایک سال کا عرصہ بھی نہ گذرا تھا، کہ جلوس کے اٹھائیسویں سال صفر سنہ ۹۹۱ھ میں، نوروز کا جشن منانے کی تیاریاں شروع ہوئیں، نہایت اہتمام اور شان سے کام ہونے لگا، مغل شہنشاہ اس جشن کو جس شوکت کے ساتھ مناتے تھے، وہ ظاہر ہے، اکبر نے خصوصیت سے اس کو کمال کے درجہ پر پہونچا دیا تھا، آج جس طرح بڑی بڑی تقاریب پر، عموماً صنعتی نمائشوں کے انعقاد سے علمی مظاہروں کا رواج ہو چلا ہے، شاید اس کو موجودہ دور کی اختراع سمجھا جاتا ہوگا، لیکن اکبر نے بھی ٹھیک اسی طرح اس نوروز میں حکم دیا، کہ امراء بھی اس میں حصہ لیں، اور اپنے اپنے کمالات کا اظہار کریں، چنانچہ دیوانِ خاص و عام کے اردگرد (۱۲۰) عالی شان ایوان تھے، ان میں سے ہر امیر کو ایک ایک ایوان عطا ہوا، کہ وہ اپنے مظاہروں کو ان میں ترتیب دے سکیں، اور اپنی قابلیتوں کے جوہر دکھائیں، ہر قابل و باکمال آدمی اپنے کمالات کے مظاہرہ کے لئے، موقع کا متجسس رہا ہی کرتا ہے، کہ اس کی داد ملے، شاہ فتح اللہ کو قدرت کی جانب سے بہت جلد یہ موقع ہاتھ لگا، انکی جیسی شہرت و شان تھی، اسی لایق اپنے ایوان کو سب سے زیادہ کامیاب بنانے کی کیا کچھ کوشش نہ کی ہوگی، مورخین لکھتے ہیں کہ

"ان کی نمائش گاہ کیا تھی، ایک عجیب و غریب علوم و فنون کا طلسم خانہ تھا، ہر بات میں نکتہ اور نکتہ میں باریکی پیدا کی تھی، گھڑیال اور گھنٹے چل رہے تھے، علم ہیئت کے آلات، کرے، ربع مجیب، اسطرلاب، نظام فلکی کے نقشے، اور ان کی مجسم مورتوں میں سیارے اور افلاک چکر مار رہے تھے، جر اثقال کی کلیں، اپنا کام کر رہی تھیں، علم کیمیا، اور علم نیرنجات کے شعبے ساعت بساعت رنگ بدل رہے تھے؛"[2]

[1] اکبر نامہ جلد اول ص ۳۱ [2] تاریخ واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول ص ۲۰۲ و منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۲۱

افسوس ہے کہ اس طلسم خانہ کی کامل تفصیل، اور اس کے پورے پورے حالات نہیں ملتے، کاش اس پرعظمت باکمال موجد کی یہ چیزیں ہمارا سرمایہ فخر بنتیں، اور اس کے کارنامے ہماری رہنمائی کرتے،

تاریخیں اس بات کو نقل کرتی ہیں، کہ اکبر کو عرصہ سے ایک نئے سنہ کے ایجاد کی دھن لگی تھی، وجہ یہ لکھی ہے کہ وہ بہت دنوں سے کہا کرتا تھا، کہ ہندوستان میں ہجری تاریخ کارآمد نہیں ہو سکتی اور اس کے سوا یہ سنہ دوستوں کی تکالیف کی یادگار، اسلام کی کلفت و ناکامی، اور اعدار کی دشمنی کا اظہار کرتا ہے، اس لئے ایسے سنہ کا استعمال مبصروں کے دلوں میں اپنے وجود سے اس حزن و ملال کی یاد تازہ کیا کرتا ہے،[1] لیکن بادشاہ ظاہر بینوں، رسمی عقلمندوں اور مذہبی لوگوں کی وجہ سے اور اس سبب سے بھی کہ دینی ضروریات کا اسی ماہ و سال پر انحصار ہے، متفکر و متردد رہا کرتا تھا کہ سنہ ۹۹۲ھ میں شاہ فتح اللہ شیرازی نے اپنے چند رفقاء کیساتھ اس مشکل کو حل کر کے ایک نئے سنہ کی داغ بیل ڈالی، اور اس کا نام اکبر کے "دین الٰہی" کے لحاظ سے "سنہ الٰہی اکبر شاہی" قرار دیا، اسکی بنا زیچ جدید گورگانی پر

[1] اکبر کا یہ خیال بالکل غلط تھا، اسلئے کہ ہجرت کے ساتھ ہی اسلام کی مصیبتوں کا خاتمہ، اور اس کی ترقی کا آغاز ہوا ہے، اسلامی سال اور اسکے قمری مہینوں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ مہینے ہمیشہ مختلف موسموں میں گردش کرتے رہتے ہیں، چونکہ اسلام سارے عالم کے لئے آیا ہے، فرض کیجئے، کہ دنیا کے کسی خطے کے باشندوں کے لئے رمضان کا مہینہ گرما میں آیا، تو چند سالوں کے بعد وہ دوسرے موسموں میں آئے گا، اور دنیا کو یہ شکایت کا موقع نہ ملیگا کہ اس نے اس مہینہ کو مختلف ممالک کا لحاظ کر کے مقرر نہیں کیا، تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کیجئے کہ اگر مئی کا مہینہ روزوں کے لئے مختص ہوتا، تو غور فرمائیے کہ اس مہینہ میں ساری دنیا میں ایک موسم نہیں ہوتا، کسی مقام کے باشندوں کیلئے روزہ آسان ہوتے تو کسی کیلئے گرمی کی شدت کی وجہ سے انتہائی مشکل اور یہ شمسی مہینے قمری مہینوں کی طرح موسموں میں گردش بھی نہیں کرتے، کیونکہ ان کا انحصار سورج پر ہے، بہ خلاف قمری ماہ و سال کے کہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو روزے اور دیگر ارکان اسلام کی ادائی میں مختلف موسموں کا مزہ چکھاتے ہیں، کسی کو کسی شکایت کا موقع باقی نہیں رہتا،

رکھی، اور جلوس اکبر کو اس نو ایجاد سال کا آغاز قرار دیا، مہینوں اور دنوں کے نام فارسی ہی بحال رکھے اور کبیسہ کو خارج کر دیا، جب یہ امور مکمل ہو چکے، تو حکم ہوا کہ ہجرت کی بجائے لفظ رحلت لکھیں[1] اور سنہ کا شمار جناب سرور کائنات صلعم کی اس عالم سے پردہ فرمائی کے وقت سے شروع کریں، چونکہ حضور صلعم نے ۱۱ھ میں وفات پائی، اسی لئے ہجری اور الٰہی سنہ میں دس سال کا تفاوت ہے[2]، بادشاہ نے تمام ممالک محروسہ میں اس نئے سال کے لئے فرامین نافذ فرمائے، اور اسی پر عمل ہونے لگا[3]،

ان کے معاصرین لکھتے ہیں، کہ شاہ فتح اللہ شیرازی اس فضل و کمال کے باوجود معمولی سی معمولی کتابیں تک پڑھانے اور ادنیٰ سواد تک کو تعلیم دینے میں پیچھے نہیں ہٹتے تھے حتی کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو "الف با" بھی پڑھایا، اور حکیم ابو الفتح کے غلام تک کو درس دیا، اس درس و تدریس کے وقت اس منصب فضیلت و علمیت کے ہوتے ہوئے بھی اپنے شاگردوں کو فحش سے فحش گالیاں دینے میں کبھی کمی نہ کی، چنانچہ ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں، اس موقع پر ان کا کیریکٹر ان الفاظ میں پیش کیا ہے، :-

"و بہ تعلیم اطفال امرا مقید بودہ و ہر روز بہ منازل مقربان رفتہ، نخست از ہمہ غلام حکیم ابو الفتح را، و دو فتنے پسر شیخ ابو الفضل و امرا زادہ ہائے دیگر ہفت ہشت سالہ، بلکہ خورد تر ازاں معلم صبیانی می کرد، و تعلیم نقطہ و خط و دائرہ بلکہ ابجد ہم می داد ....

.... و تفنگ بر دوش، و کیسہ دارو، بر میان بستہ، چوں قاصدان بہ صحرا در رکاب می دوید و شان علمی کہ نماندہ بود، او بالکل بر خاک زد، و با وجود ایں ہمہ بے شانی و رذلی و خسیسی، در رسوخ اعتقاد، پہلوانی کرد کہ ہیچ رستم نہ کند"[4]

[1] منتخب التواریخ جلد دوم ص ۳۱۱، [2] حکومت آصفیہ (حیدر آباد) جو مغلیہ سلطنت کی یادگار سمجھی جاتی ہے، اس نے بھی موسم اور فصلوں کی رعایت کی وجہ اپنے لیے اسی الٰہی سنہ و تاریخ کو اپنا مالیہ اور دفتری سنہ قرار دیا ہے اور یہاں یہ فصلی سنہ کہلاتا ہے، اسوقت ۱۳۴۶ف ہے، [3] ماثر الامراء جلد اول ص ۱۰۲، [4] منتخب التواریخ جلد سوم ص ۳۱۶

میر صاحب ۹۹۳ھ میں جلوس کے تیسویں سال کے آغاز پر امین الملک بنائے گئے اور ساتھ ہی حکم ہوا کہ راجہ ٹوڈرمل دیوان کل کے ساتھ، دفتری کام اور امور سلطنت کے انصرام میں مصروف ہوں، اور راجۂ موصوف کو تاکید ہوئی، کہ وہ میر صاحب کی صلاح و صوابدید پر چلا کریں اور مظفر خان کی دیوانی سے اس وقت تک جتنے دفتری معاملات ملتوی پڑے ہیں، وہ بہت جلد ان کے مشورہ سے تکمیل کو پہونچائے جائیں، چنانچہ شاہ صاحب نے کمر ہمت چست کی، اور کاغذات و امثلہ کی رو سے مقدمات کو فیصل کیا، جو باتیں اصلاح طلب تھیں، ان کی ایک رپورٹ اور ان کے لئے تجاویز بھی پیش کیں، جو کچھ لکھکر گذرانا، وہ حضور سے حرف بہ حرف منظور ہوا[1]، یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دفتر مال و دیوانی کی تہذیب و ترتیب، اور اس کی اصطلاحیں تنہا صرف ٹوڈرمل کی ایجاد نہیں، بلکہ اس میں میر صاحب کا بھی حصہ ہے،

(باقی)

[1] ماثر الامراء جلد اول ص ۱۰۱،

مولوی احسن اللہ خانصاحب ثاقب مرحوم اور اُن کی کتابیں

مولوی احسن اللہ خانصاحب ثاقب مرحوم کی کتابیں مکاتیب امیر مینائی اور گوہرین نامہ ایک عرصہ سے ہمارے یہاں ایجنسی کی کتابوں میں داخل ہیں، کئی سال ہوے کہ مرحوم کا انتقال ہو گیا، مرحوم نے اپنی بیوہ کے لئے بجز اس قلمی سرمایہ کے اور کوئی چیز نہیں چھوڑی ہے، ایسی حالت میں مولف مرحوم کے ہمدردوں، شناساؤں اور قدردانوں سے گذارش ہے، کہ وہ ان کی ان کتابوں کو کار خیر سمجھ کر خرید فرمائیں، تاکہ اس صورت سے ان کی غمزدہ بیوہ کی امداد کا کچھ انتظام ہو سکے،

قیمت:- مکاتیب امیر مینائی مع سوانحعری امیر مرحوم، ۱۲؍ گوہرین نامہ (فارسی مخطوطہ) ۸؍

"منیجر"

جاپان میں اسلام کی مشکلات کا حل

از

پروفیسر نور الحسن برلاس ٹوکیو (جاپان)

عربوں نے اسلام کی تبلیغ میں تمام دنیا چھان ماری، اور جہاں گئے، احکام الٰہی پہونچانا اپنا فرض سمجھا، جاپان تک عربوں کی رسائی نہ ہوسکی، شاید اس وجہ سے کہ یہ مشرق کا بعید ترین ملک ہے، یا اس وجہ سے کہ اسے تاریخ میں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، اور طوفان خیز سمندروں کے مصائب نے ان جزائر کی کشش کو کم کر دیا تھا، بہر حال اہل جاپان تک اسلام کی تعلیم نہ پہونچ سکی اور وہ اسلام سے نابلد رہے، جاپانیوں کی لاعلمی کے ذمہ دار در اصل مسلمان ہیں، جنھوں نے اپنے فریضۂ اعلائے کلمۃ الحق کی ادائگی میں کوتاہی برتی، اگر وہ ہمت کرکے یہاں اسلام کی تبلیغ کرتے، تو ممکن نہین کہ جاپانی لبیک نہ کہتے، کیونکہ یہ لوگ من حیث القوم غیروں کی اچھی باتیں بہت جلد قبول کرکے اختیار کر لیتے ہیں، دوسری صدی عیسوی میں کنفیوشس کے عقائد چین سے آئے، اور چھٹی صدی میں بدھ مت ہندوستان سے نکل کر چین اور کوریا ہوتا ہوا یہاں پہونچا، ان دونوں مذاہب کے عقائد جاپانیوں کے رگ و ریشہ میں اس قدر سرایت کر گئے ہیں، کہ زندگی کا کوئی فعل ان کے اثر سے خالی نہیں، مغربی اقوام کے داخلہ کے ساتھ عیسائیت نے انیسویں صدی کے آخر میں قدم جمائے، اور اب اچھی طرح جڑ پکڑ لی ہے، عیسائیت کا داخلہ در اصل سولھویں صدی میں ہوا تھا، مگر غیر ملکی پادریوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں سے مجبور ہو کر حکومت کو ایک صدی کے اندر ہی اندر اس کا قلع قمع کرنا پڑا، فی زمانہ عیسائیت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب وارد ہوئی، اور تھوڑے عرصے

میں تمام جاپانیوں پر چھا گئی۔

جاپانیوں میں غیروں کے طور طریقے اختیار کرنے کی، اور ان میں کاٹ چھانٹ کرکے ملکی حالات کے بموجب موزوں بنا لینے کی حیرت انگیز قابلیت ہے ان حالات میں اس طباع قوم کی نظر سے اسلام کا اوجھل رہنا بعید از فہم واقعہ ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اہلِ جاپان فطرۃً نہایت وضع دار واقع ہوئے ہیں، اور ظاہری شان رکھنے والی اشیا ان کے دلون پر بہت اثر کرتی ہیں، عقائد کنفیوشس اور بدھ مت کے داخلے کے وقت خاقان چین کی وسیع متمدن اور طمطراق والی سلطنت نے ضرور اپنا رنگ دکھایا ہوگا، نیز مغربی تمدن کی آمد پر یورپ و امریکہ کی شان و شوکت کا جادو چلا ہوگا، اسلامی حکومت کے عروج کے وقت مسلمانوں نے موقع ہاتھ سے کھو دیا، مگر زمانہ حال میں اسلام کی اشاعت کا زیادہ موقع ہے، کیونکہ یہ دین فطرت ہے، اور عقلِ انسانی کے مطابق ہے۔

باوجودیکہ مسلمانوں نے جاپان میں تبلیغِ اسلام سے غفلت برتی جاپانیوں نے مغرب سے روشناس ہونے پر اس سے بے اعتنائی روا نہ رکھی، مگر انھیں اسلام کے متعلق تحقیقات کرنے میں مغرب کی جانب ہی رجوع ہونا پڑا، اہلِ مغرب کے تعصب کا یہ عالم تھا کہ پادریوں نے جو کچھ کہہ دیا، اس پر ایمان لے آئے، اور پادریوں کو ہمیشہ اسلام میں کیڑے ہی کیڑے نظر آتے رہے، لہذا انھوں نے اسلام کی جو تصویر عیسائی ممالک کے سامنے پیش کی ہے، وہ نہایت بھیانک ہے، جاپانی انھی کی تصانیف سے مستفید ہوئے ہیں، اور انھی کے تراجم و اقتباسات اپنی زبان مین شائع کئے ہیں، ظاہر ہے کہ اسلام کے بارے میں جاپانی کتابیں کیسی گمراہ کن ہوں گی،

جاپان میں اسلام کے خلاف غلط بیانی عام کتب تک محدود نہیں ہے، بلکہ درسی کتب تک پہنچ گئی ہے، اور یہ نہایت مضرت رساں ہے، ثانوی مدارس کے استعمال کے لئے تاریخ کی جو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں ان سب میں آنحضرت صلعم کی زندگی اور تعلیم کے بارے میں کافی غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے

جن کے پڑھنے سے آیندہ نسلوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف ایک غبار بھرا ہوگا اس بارے میں جاپانیوں پر دھوکہ دہی کا یا دانستہ غلط پروپگنڈا کرنے کا الزام لگانا بالکل ناجائز ہے، انھوں نے ان ذرائع سے معلومات حاصل کی ہیں، جہاں آسانی سے دستیاب ہوسکتی تھیں یعنی مغرب سے جو موجودہ زمانے میں علم کی مشعل سے دنیا کو منور کر رہا ہے، اس لئے مجرم دراصل مغربی مصنفین ہیں نہ کہ جاپانی،

جاپان میں اسلامی تعلیمات کے ساتھ جو بے انصافی برتی جارہی ہے، اس کے انسداد کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر ہی عائد ہوتی ہے، انھیں جاپانیوں کے لئے ایسی زبان میں صحیح معلومات فراہم کرنی چاہئیں، جس کا سمجھنا ان کے لئے آسان ہو، اسی ذریعے سے اسلام کے خلاف غلط بیانی کی تردید ہوسکتی ہے، اگر جاپانی مدارس میں موجودہ گمراہ کن تعلیم جاری رہی، تو اس کا نتیجہ خطرناک ہوگا، اس سے اہل جاپان اور مسلمانوں میں دوستی کا رشتہ تو پیوست ہو نہیں ہوسکتا، بلکہ جاپانیوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا ہوں گے، اور جب جاپانیوں کے طرزِ عمل سے نفرت کا اظہار ہوگا، تو جواب میں مسلمان بھی جذباتِ نفرت کا اظہار کرنے پر مجبور ہوں گے، ہر ملک کے مدبرین کو اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد ہوکر مرض کے علاج کی فکر کرنی چاہیئے، مجھے جن جن ذمہ دار جاپانیوں سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے، انھوں نے غلطی کا انسداد کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے،

پچھلے سال مجھے ٹوکیو کی اورنٹیل کلچر سوسائٹی کی جانب سے اسلامی رواداری پر تقریر کرنے کیلئے مدعو کیا گیا تھا تقریر کے ضمن میں مجھے اپنے تلخ تجربے کا اظہار کرنا پڑا، کہ تقریباً ہر نوجوان جاپانی کے منہ سے میں نے یہ سنا ہے، کہ یہ حضرت محمد صلعم نے اسلام کی تبلیغ اس طرح کی ہے کہ داہنے ہاتھ میں تلوار اور بائیں میں قرآن شریف لے کر نکلتے تھے، یہ لوگ اپنی معلومات کا ماخذ مدارس ثانوی کی کتب تاریخ کو بتاتے تھے، جو میری تحقیقات سے صحیح نکلا، میں نے سوسائٹی مذکور کی توجہ اس جانب مبذول کراکے جناب صدر سے درخواست کی کہ صاحب موصوف یہ امر محکمۂ تعلیم کے گوش گذار کرکے یہ خواہش

کریں کہ علمائے جاپان تاریخِ اسلام کی معقول تحقیقات کرکے کتبِ تاریخ کی تصحیح کردیں جناب کاجو ناکامرا صاحب کا جو اس سوسائٹی کے بانی اور صدر ہیں، نہایت ممنون ہوں، کہ صاحب موصوف نے نہ صرف اپنی انجمن کے رسالہ "جاپانیز ابراڈ" میں میری تقریر شائع کردی، بلکہ پارلیمنٹ کے جاڑے کے اجلاس میں بحیثیت ایک رکن کے یہ مسئلہ اٹھادیا، آپ نے نواب وزیر محکمۂ تعلیم، اور نواب وزیر محکمۂ ماورائے بحر دونوں سے اس بارے میں استفسارات کئے اور اس مشکل کو حل کرنے کے وعدے لئے، یہ استفسارات رسالہ مذکور کے ماہ اپریل ۳۷ء کے پرچے میں جاپانی زبان میں شائع ہوچکے ہیں، ان کا ملخص یہاں درج ہے:-

"حال میں، میں نے نواب وزیر محکمۂ تعلیم کی خدمت میں غیر اقوام کے مذہب اور دستور وغیرہ کی بابت استفسار کیا تھا، آج میں وہی استفسار نواب وزیر محکمۂ ماورائے بحر کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ہمیں اپنی قوم کی توسیع کے لئے یا تو ان ممالک میں ہجرت کرنی پڑی ہے، جن میں بجائے سفید فام اقوام کے رنگین اقوام کے باشندے آباد ہیں، یا ان سے دوسری قسم کے تعلقات قائم کرنے پڑے ہیں مثلاً افریقہ، مشرق قریب مشرق بعید اور جنوبی بحرالکاہل کے جزائر ان ممالک میں حضرت محمد (صلعم) کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ ہے، جن کے مذہب کو دنیا میں بدنام کیا جاتا ہے، اور اس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے، مسلمانوں کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ انھوں نے سیدھے ہاتھ میں تلوار اور الٹے میں قرآن شریف لے کر مذہب کی اشاعت کی ہے، یہ اقوال غیر مسلم اقوام میں رائج ہیں، اور ان کی بنا پر وہ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں، یہ غلط بیانی دراصل سفید فام اقوام نے دنیا میں فساد برپا کرنے کیلئے رائج کی ہے، حقیقت میں مسلمان جنگ وجدل کے خلاف ہیں، اور وہ بنی نوع انسان میں اخوت ومساوات پھیلانے کے مدعی ہیں، مجھے بذاتِ خود مذہب کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں، مگر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جاپانی مدارسِ ثانوی کی مروجہ کتبِ تاریخ میں یہ غلط

روایات درج ہیں، لہذا میں حکومت کی خدمت میں یہ مشورہ پیش کرتا ہوں کہ اس مسئلہ کی کامل تحقیقات کی جائے، اور جہاں غلط بیانی ثابت ہو، اسکی تصحیح کردیجائے، اس بارے میں محکمۂ امور بحر اور محکمۂ امور خارجہ کو محکمۂ تعلیم کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے"۔

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ محکمہ جاتِ متعلقہ کے نمایندوں نے جناب ناکا مُرا صاحب سے ہمدردی کا اظہار کیا، اور اس کے متعلق مناسب کارروائی کرنے کا وعدہ کیا، اب یہ کام دنیائے اسلام پر منحصر ہے، کہ تحقیقات اور تصحیح کے لئے مواد فراہم کردے،

تلخیص و تبصرہ

خرگوشی کا رسالۂ تصوف

مسٹر اربری (A. J. Arberry) نے بلیٹن آف دی اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن (جلد ۹ حصہ ۲، سنہ ۱۹۳۸ء) میں خرگوشی کے رسالۂ تصوف پر حسب ذیل نوٹ لکھا ہے:-

مجھے انڈیا آفس لائبریری میں ابوسعد عبد الملک بن محمد بن ابراہیم الواعظ الخرگوشی کے رسالۂ تصوف تہذیب الاسرار کے دیکھنے کا موقع ملا، خرگوشی نے جو نبی کریم صلعم کی ایک ضخیم سوانح عمری اور خوابوں کی تعبیر پر ایک رسالہ تصنیف کرنے کی وجہ سے بھی مشہور ہوا ۴۰۶ھ مطابق ۱۰۱۵ء یا ۴۰۷ھ مطابق ۱۰۱۶ء میں وفات پائی، اس لئے اس کا زمانہ سُلمی (متوفی ۴۱۲ھ / ۱۰۲۱ء) ابونعیم الاصفہانی (متوفی ۴۳۰ھ / ۱۰۳۹ء) اور قشیری (متوفی ۴۶۵ھ / ۱۰۷۲ء) سے پہلے ہے لیکن سراج (متوفی ۳۷۸ھ / ۹۸۸ء) کلاباذی (متوفی ۳۸۵ھ / ۹۹۵ء) ابوطالب المکی (متوفی ۳۸۶ھ / ۹۹۶ء) اس سے بھی پہلے کے ہیں، ان مقابلوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ خرگوشی تصوف پر لکھنے والوں میں کافی قدیم ہے، اس کا نام ان آٹھ مستند مصنفین کی فہرست میں شامل نہیں ہے، جو نکلسن (Nicholson) نے قدیم تصوف کی تاریخ کے لئے تیار کی ہے، اور نہ اس کی جانب اتنی توجہ کی گئی ہے جتنی توجہ کا وہ مستحق ہے، اگرچہ یہ صحیح ہے، کہ میسیناں (Massignon) نے حلاج کے مطالعہ میں اس سے استفادہ کیا ہے، اس نوٹ کا مقصد یہ ہے، کہ رسالہ مذکور کے متعلق جو مختصر حالات آلوارٹ (Ahlwardt) نے لکھے ہیں، ان پر اضافہ کیا جائے، نیز خرگوشی کے رسالہ کی صحیح

قدر وقیمت کا اندازہ بحیثیت ایک اصلی ماخذ کے کیا جائے،

جیسا کہ آوارٹ نے کہا ہے، تہذیب الاسرار اپنی موجودہ شکل میں خود خرگوشی کے قلم کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ اس کے ایک شاگرد کی تالیف ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب خرگوشی سے دو پشت بعد کی ہے، جیسا کہ ان اسناد سے ظاہر ہے، جو پہلے باب کے شروع میں نیز کتاب کے دوسرے مقامات پر دی ہوئی ہیں،

أخبرنا ابو عبد الله محمد بن احمد بن موسیٰ الشیرازی بمکة، قال اخبرنا الامام الزاهد ابو سعد قال ... الخ

اسی طرح کتاب اللمع سراج کے ایک شاگرد سے منقول ہے، اس عبد اللہ الشیرازی کے متعلق تاریخ بغداد (جلد ا ص ۶۰-۳۵۹) میں ایک دلچسپ تبصرہ ہے، خطیب کی روایت کے مطابق جس کا بیان ہے کہ اس نے ۴۱۰ھ (۱۰۱۹ء) میں کچھ دنوں خود شیرازی سے حدیث لکھی، شیرازی نے بغداد میں ایک واعظ اور درویش کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کی، لوگ اس کے زہد و اتقا کی نمائش سے دھوکے میں آجاتے تھے، اور اس کی مجلسوں میں ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتے تھے، اس نے ایک شکستہ مسجد کی مرمت کرائی، اور پھر اس مسجد کو خانقاہ بنا لیا، اور اپنے مداحوں سے حاصل کرکے بڑی دولت جمع کی، اب اس نے پیوند لگے ہوئے لبادہ کا پہننا ترک کر دیا، اور بیش قیمت لباس پہننے لگا، اس نے غزوہ کے لئے اپنی ایک خاص فوج بھی تیار کر لی، اور بیان کیا جاتا ہے کہ آذربیجان کے گورنر کے مقابلہ میں وہ اپنی فوج لے کر بڑھا بھی تھا، ۴۲۹ھ مطابق ۱۰۳۷ء میں آذربیجان کے قریب اس کا انتقال ہو گیا، خطیب مختصر طور پر صرف اس قدر کہتا ہے، کہ حدیث کے راوی کی حیثیت سے وہ ضعیف سمجھا جاتا تھا،

اگر خطیب کا بیان صحیح ہے، تو ایسا شخص خرگوشی کی تہذیب الاسرار کا آخری راوی تھا، اسکی شہرت کی وجہ سے اعتماد نہیں پیدا ہوتا، خود اس کتاب کا تجزیہ بھی زیادہ اطمینان نہیں بخشتا، یہ دیکھکر کافی حیرت

ہوتی ہے، کہ صفحات (۱۰) ب لغایۃ (۱۱) الف پر صوفی کی جو تعریف درج ہے، وہ شیخ عبد القادر الجیلی کی طرف منسوب ہے، وہی شیخ عبد القادر جو غنیہ اور دوسری مشہور کتابوں کے مصنف ہیں، اور جن کا انتقال خرگوشی کی وفات کے ڈیڑھ صدی بعد ۵۶۱ھ مطابق ۱۱۶۶ء میں ہوا، یہ صحیح ہے، کہ صفحہ (۱۱) الف کے حاشیہ پر کاتب (۸۴۴ھ / ۱۴۴۰ء) کے ہاتھ کا ایک نوٹ اس مضمون کا ہے، کہ یہ عبارت بعد کو بڑھائی گئی ہے، جو ابو سعد کے نسخے میں نہیں ملتی، اور اسی قسم کا ایک بیان ص (۱۰) الف کے متن میں بھی ابن خفیف (متوفی ۳۷۱ھ / ۹۸۲ء) کے ایک قول کی نسبت درج ہے، لیکن یہ دونوں عبارتیں (ممکن ہے کہ اور بھی ہوں) اس بات کو ثابت کرتی ہیں، کہ اصل نسخہ میں بعد کو اضافہ کیا گیا ہے، یہ مشکل قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، کہ کاتب کے سامنے خرگوشی کا اصل مسودہ تھا، اس نے غالباً کتابت کے وقت محض ایک بالکل قدرتی نتیجہ نکالا ہے، جس سے اس کی ذہانت ظاہر ہوتی ہے،

کتاب کے اصل ڈھانچہ پر نظر ڈالنے سے فوراً واضح ہو جاتا ہے، کہ یہ تمام تر کتاب اللمع کے طرز پر لکھی گئی ہے، اتنا تو اسی وقت ظاہر ہو جاتا ہے، جب اس کے ابواب کی فہرست جسے آوارٹ نے مکمل طور پر دیا ہے، سراج کی کتاب کی فہرست مضامین کے مقابلہ میں رکھی جاتی ہے، دونوں میں ابتدا تصوف کی تعریف سے ہوتی ہے، (جیسا کہ بالکل قدرتی ہے) فرقۂ ملامتیہ پر ایک باب، جو اس وجہ سے اور زیادہ اہم ہے، کہ اس عہد میں صرف سلمی کی اصول الملامتیہ اس مضمون کی دوسری مستند کتاب ہے، مضامین کی یکسانی کو منقطع کر دیتا ہے، لیکن اس کے بعد دونوں کتابوں میں ایک فصل معرفت پر آتی ہے، اسکے بعد خرگوشی میں احوال اور مقامات کے ابواب آتے ہیں، اور سراج میں مقامات اور احوال کے، اس کے متعلق زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ تہذیب الاسرار کا ڈھانچہ کتاب اللمع کے ڈھانچے سے اس قدر ملتا جلتا ہے، کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خرگوشی (یا اس کے ایڈٹ کرنے والے) نے سراج ہی کی کتاب کو بغیر کسی اعتراف کے نمونہ کے طور پر استعمال کیا،

اتنا ہی نہیں، خرگوشی (یا اس کا ایڈٹ کرنے والا) پوری پوری عبارت اخذ کر لیتا ہے، نہ صرف ان ابواب میں جہاں قدیم صوفیہ کے اقوال متن کا بڑا حصہ ہیں، بلکہ ان ابواب میں بھی جن میں تصوف کی اصطلاحات کی تعریف کی گئی ہے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل مثالوں سے واضح ہوتا ہے،

(۱) ومنھا المقام وھو الذی یقوم با لعبد فی الاوقات من انواع المعاملات وصدق المجاھدات فمتی اقیم العبد فی شیئ منھا علی التمام فھو مقامہ حتی ینتقل منہ الی مقام آخر، (تہذیب ص ۲۳۰)

والمقام ھو الذی یقوم بالعبد فی الاوقات مثل مقام الصابرین والمتوکلین وھو مقام العبد بظاھرہ وباطنہ فی ھذہ المعاملات والمجاھدات والارادات فمتی اقام (اقیم) العبد فی شیئ منہ علی التمام فھو مقامہ حتی ینتقل منھا الی مقام آخر، (اللمع ص ۳۳۵)

(۲) ومنھا المکان وھو لاھل الکمال والتمکین والنھایۃ فاذا کمل العبد فی معانیہ فقد تمکن فی المکان، (تہذیب صـ۲۳۰)

والمکان ھو لاھل الکمال والتمکین والنھایۃ فاذا کمل العبد فی معانیہ تمکن لہ المکان الخ (اللمع صـ۳۳۵)

(۳) ومنھا الطوالع وھی انوار التوحید تطلع علی قلوب اھل المعرفۃ شعاعھا فیطمس سلطان نورھا سائر الانوار کما ان سلطان الشمس یطمس انوار الکواکب، (تہذیب صـ۲۳م)

والطوالع انوار التوحید تطلع علی قلوب اھل المعرفۃ بتشعشعھا فیطمئن ما فی القلوب من الانوار بسلطان نورھا کالشمس الطالعۃ

اذا طلعت یخفی علی الناظر من سطوۃ نورھا انوار الکواکب وھی فی اماکنھا (اللمع صـ۳۴۵)

اس فہرست کو طول دینے کی ضرورت نہیں، صفحے کے صفحے سرقہ کی مثالوں سے پر ہیں،

یہاں تک تو تخریبی تنقید تھی، اس کا دوسرا رُخ یہ ہے، کہ تہذیب الاسرار اپنے بہت سے ابواب میں اللمع سے زیادہ مکمل ہے، اور اس میں سیکڑوں اقوال اور بہتیرے اشعار اور مکتوبات کے ابتدائی اجزار ایسے ہیں، جنکو سراج نے نقل نہیں کیا ہے، اور نہ غالبًا کہیں اور محفوظ ہیں، گو یہ یقینی معلوم ہوتا ہے، کہ تقریبًا ہر جگہ خرگوشی کسی دوسرے شخص کی روایت نقل کرتا ہے، تاہم چونکہ اس کے مآخذ اب موجود نہیں ہیں، اس لئے اسکی اہمیت وہی ہو جاتی ہے، جو ایک اصلی مصنف کی ہے، ملامتیہ پر جو باب اس نے لکھا ہے، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس کے علاوہ ولیوں کی کرامات اور نبیوں کے معجزات پر بھی ابواب ہیں، جن پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے اپنے ذاتی خیالات پیش کئے ہیں، نیز چند مقامات پر مصنف نے اپنے ذاتی تجربات بھی بیان کئے ہیں، خصوصًا اس باب میں جو ہواتف سے متعلق ہے،

کتاب کے اس تجزیہ سے ظاہر ہوگا، کہ تاریخ تصوف کے اصلی ماخذ کی حیثیت سے تہذیب الاسرار کو وہ درجہ نہیں دیا جا سکتا، جو سراج کی، کلاباذی اور قشیری کی تصانیف کو حاصل ہے، علاوہ برین سلمی اور ابو نعیم الاصفہانی کی تصانیف بھی مستند ماخذوں میں شمار کی جاتی ہین، پھر بھی اگرچہ تہذیب الاسرار کے موجودہ نسخہ میں جو برلن کے قلمی نسخہ کی تنہا سند پر مرتب کیا گیا ہے، سرقہ کی مثالیں بہت ہیں، اور اسکی سندِ روایت بھی قابلِ اعتبار نہیں، جسکی وجہ سے اس کا شائع کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، یہ ایک ایسا ماخذ ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا سکتا، اور تصوف کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی، جس میں خرگوشی کی کتاب سے استفادہ نہ کیا گیا ہو،

"ع ز"

عرب اور غیر ملکی کلچر

میجر گلب (G. B. Glubb) نے عربی تہذیب اور غیر ملکی کلچر کے باہمی تعلقات پر ایک مقالہ جرنل آف دی رائل سنٹرل ایشین سوسائٹی (Journal of the Royal Central Asian Society) میں لکھا ہے، جس کا خاتمہ رسالہ مسلم ورلڈ (اپریل ۳۰ء) میں نقل ہوا ہے، اس کا ملخص ترجمہ درج ذیل ہے،:-

ایک طریقہ سے یہ تمام مضامین جن پر ہم نے بحث کی ہے، یعنی حکومت، عدل و انصاف، تجارتی کاروبار، فوج اور حب الوطنی سطحی ہیں، یوں کہئے کہ وہ ایک رواجی تقلید ہیں، سیرت کی کوئی بنیادی تبدیلی نہیں، لیکن میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے، کہ یورپ کی مثال عربوں کے حسنِ اخلاق کی جڑ کھود رہی ہے، ایک نہایت معنی خیز بات میں نے گذشتہ چند سالوں میں یہ دیکھی ہے کہ عرب جب اہل یورپ کو کسی کام کے کرنے کا مشورہ دیں گے تو اکثر یہ کہیں گے، "بے شک ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر شخص صرف اپنی غرض پوری کرنی چاہتا ہے، لیکن جو تجویز میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اس سے آپ ہی کو نفع پہونچے گا"، اگر وہ اس چیز کو اخبارات میں لکھتے یا سیاسیات میں استعمال کرتے، تو خیال ہو سکتا تھا کہ یہ پروپگنڈا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حقیقۃً ان کا یہ خیال ہے، کہ ایک یورپین سے گفتگو کرنے میں سب سے زیادہ دلنشین دلیل اسکے لئے اسکا ذاتی نفع ہو، جب کسی یورپین کو قائل کرنا چاہتے ہیں تو یہی دلیل استعمال کرتے ہیں،

عرب دیکھتے ہیں کہ یورپ طاقتور اور کامیاب ہیں، اور وہ اس کامیابی کا سبب معلوم کرنا چاہتے ہیں بعض سمجھتے ہیں کہ انھوں نے کامیابی کا اصلی سبب پالیا ہے، وہ یہ کہ یورپ میں ہر فرد اور ہر قوم تمام دوسرے خیالات سے نظر پھیر کر صرف اپنے ذاتی فائدہ کے حصول میں ہمہ تن مصروف ہے، نتیجہ یہ ہے کہ جتنا ہی زیادہ عربوں کے تعلقات اہل یورپ سے بڑھتے جاتے ہیں، اتنا ہی ان میں دولت کی خواہش بھی بڑھتی

جاتی ہے، سخاوت اور مہمان نوازی صدیوں سے عربوں کے مخصوص اوصاف ہیں، لیکن یورپین تہذیب کے زیر اثر یہ اوصاف اب ان سے کم ہوتے نظر آرہے ہیں، جنگ سے قبل بہت کم عرب قصبے ایسے تھے، جنمیں کھانے کی کوئی دوکان تھی، تمام سیاحوں اور مسافروں کی مہمان نوازی کیجاتی تھی، میں نے عربوں کو ہمیشہ ایک نہایت بامروت، دردمند، اور نرم دل قوم پایا ہے، تمام عرب مفلس ضعیف العمر اور نابینا اشخاص کی مدد خوشی سے کرتے ہیں، اور نہ صرف ان کی بلکہ ہٹے کٹے اور فضول خرچ لوگوں کی بھی، جب تک کسی عرب کے پاس کھانا ہے، کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا، دنیا میں عرب لڑنے مارنے والے اور لٹیرے مشہور کئے جاتے ہیں، لیکن خود میں نے ان کو ایک شریف، فیاض اور فلسفی قوم پایا ہے،

اصلی عرب کی ایک اور خاص خصوصیت ہر کسی اپیل سے متاثر ہو جانا میرا خیال ہے کہ اہل یورپ عربوں کے اس وصف کا بہت شاذ ذکر کرتے ہیں، اور شاذ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں، یورپ والے دلیل یا حساب سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، جسکی وجہ سے قائل کرنے میں انھیں بالکل ناکامی ہوتی ہے، لیکن اگر آپ کسی عرب کی عزت سے اپیل کریں یا اسکی مدد چاہیں تو جتنا آپ نے مانگا ہے، وہ سب دیدے گا، بلکہ اس سے زیادہ، عرب جو فطرۃً سخی، رحم دل اور حساس واقع ہوا ہے، یورپ کے زیر اثر اپنے بعض بہترین فضائل کھوتا ہوا نظر آتا ہے،

جن خیالات کو میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے،:-

اول یورپین کلچر کا اثر اسوقت مغربی ایشیا میں زیادہ ہے، یہ غالباً ایک عارضی حالت ہے، تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، کہ زمانہ گذشتہ میں تقریباً برابر مدت تک یکے بعد دیگرے ایشیائی کلچر کا اثر یورپ پر اور یورپین کلچر کا اثر ایشیا پر پڑا ہے، یہ اثر عموماً تعلیم یافتہ طبقوں پر پڑتا ہے، اور صرف وہی غیر ملکی کلچر کو قبول کرتے ہیں، کسان طبقوں کے لوگ اکثر غیر متاثر رہتے ہیں، اور وہی بالآخر اصلی ملکی کلچر کی طرف عود کا سبب بنتے ہیں،

دوم :- اگر ہم مغربی ایشیا کی موجودہ حالت پر غور کریں، تو یہ مان لیں گے، کہ عرب یورپ کی د
سے فائدہ حاصل کرسکتے ہیں، خصوصاً تنظیم اور سائنٹفک طریقوں میں اور شاید ملکی خدمات سے متعلق بعض شہری
خوبیوں میں بھی بشرطیکہ یہ خوبیاں حد سے گذر کر انتہائی قومیت کی شکل نہ اختیار کریں، لیکن دوسری صورتوں
میں حکومت عدل وانصاف، اور فوج سے متعلق عربوں کی روایات مختلف ہیں، میں کہوں گا، کہ مقامی
حالات کے لحاظ سے یہ روایات جہاں ناموزوں ثابت ہوئی ہیں وہاں ان میں بتدریج ترمیم کردینی چاہئے،
نہ کہ یوروپین خیالات کو داخل کرنے کے لئے انھیں بالکل خارج کردینا چاہئے،

سوم :- عرب یوروپین اخلاق کو حقیر نظر سے دیکھتے ہیں، ان پر یہ اثر ہے، کہ اہل یورپ صرف اپنی غرض
کے بندے ہیں، جب تک یورپ کے لوگ اس سے زیادہ بلند معیار نہ قائم کردیں اخلاقی دائرہ میں ان کا اثر
عربوں کو فائدہ نہیں پہونچا سکتا، جب اقتدار عربوں کو حاصل تھا تو انھوں نے یورپ کو شریفانہ بہادری
بخشی، ہمیں امید کرنی چاہئے کہ اس کے جواب میں یورپ انھیں مادیت نہ دے گا، "ع ز"

اخبار علمیہ

فوٹوگرافی سے جرائم کا انکشاف

سائنس کی ترقی سے جرائم کی تفتیش میں بھی بہت کچھ مدد مل رہی ہے، کچھ عرصہ سے فوٹوگرافی کی
صنعت نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اب وہ جرائم کے انکشاف کا ایک اہم آلہ بن گئی ہے، ذیل میں فوٹو
گرافی کے اس کمال کے چند دلچسپ واقعات درج کئے جاتے ہیں:

ایک روز شام کو ایک شخص ہاتھ میں لکڑی کا ایک ڈبہ لئے ہوئے جو اخبار میں لپٹا ہوا تھا، ایک
گودام میں چپکے سے داخل ہوا، اور وہ ڈبہ وہاں چھوڑ کر تیزی کے ساتھ باہر نکلا، اور غائب ہوگیا، ٹھیک
تیس منٹ کے بعد گودام کے اندر بم پھوٹنے کا ایک نہایت سخت دھماکا ہوا، جس سے پڑوس کے
مکانات بھی ہل گئے، اور گودام کا ایک حصہ اور کھڑکیاں وغیرہ پاش پاش ہوگئیں، ذخیرہ دار جو اس وقت
خوش قسمتی سے عمارت کے باہری حصہ میں تھا بال بال بچ گیا، فوراً پولیس نے موقع پر پہونچکر گودام
گھر کی ہر چیز کا جائزہ لیا، اور مختلف تصویریں لیں، مگر کچھ سراغ نہ لگا، سڑک پر موٹر کے پہیے کے جو
نشانات تھے، ان کی تصویر بھی لی، اس سلسلہ میں انھیں لکڑی کے اس ڈبہ کے ٹکڑے مل گئے،
جس میں بم رکھا ہوا تھا، انھوں نے تلاش کرکے تمام ٹکڑوں کو جمع کیا، ایک ٹکڑے میں انگلی رکھنے کی
جگہ بنی ہوئی تھی، جیسی اسکولوں کے چاک کے ڈبوں میں بنی رہتی ہے یہ ایک ننھی خبر سراغ تھا، لیکن
جرم کا انکشاف جس حیرت انگیز شہادت سے ہوا، وہ ڈبہ کے ایک دوسرے ٹکڑے نے فراہم کی، خوردبین
سے بغور دیکھنے پر معلوم ہوا، کہ اس ٹکڑے پر کوئی عبارت نہایت ہلکے حروف میں چھپی ہوئی نظر آتی

ایک خاص قسم کے کیمرے سے اس ٹکڑے کی تصویر لے لی گئی، تصویر میں اخبار کی ایک عبارت کا عکس اتر آیا، جو اگرچہ بہت خفیف تھا تاہم پڑھا جا سکتا تھا، واقعہ یہ تھا، کہ بم کے پھوٹنے سے ڈبے کے ٹکڑے اتنے زور سے اڑے کہ رگڑ کی سختی سے ایک ٹکڑے پر اخبار کی عبارت کا ہلکا سا نشان پڑ گیا تھا، تحقیقات سے معلوم ہوا، کہ وہ عبارت ایک ایسے اخبار کی تھی، جو بم پھوٹنے سے صرف بارہ گھنٹے پیشتر پڑوس کے ایک شہر میں شائع ہوا تھا، اس نشان سے ذخیرہ دار کے ایک مشہور و معلوم دشمن کا پتہ لگ گیا، جو اس شہر کے ایک اسکول میں ملازم تھا، پولیس کی جرح پر مجرم نے جرم کا اقرار بھی کر لیا،

چند روز ہوئے نیویارک شہر میں ایک شخص خنجر سے ہلاک کر دیا گیا، قاتل کا نشان کہیں بھی مل نہیں رہا تھا، اس سلسلہ میں ایک مشتبہ شخص کی تصویر اس خاص قسم کے کیمرے سے جو تفتیشِ جرائم کیلئے ایجاد کیا گیا ہے، لے لی گئی، تصویر میں قمیص کے دامن پر ایک نہایت خفیف سا سرخ دھبا نظر آیا، جو بظاہر بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا، کیونکہ قمیص بہت صاف دھلی ہوئی تھی، اور اس پر کہیں کوئی داغ نہ تھا، جب اس دھبہ کے متعلق اس شخص سے سوال کیا گیا تو وہ گھبرا گیا، اور متضاد جوابات دینے لگا، لیکن بالآخر عاجز آکر اُس نے اقرار کیا، کہ یہ دھبہ مقتول ہی کے خون کا ہے، قمیص بہت احتیاط سے نہایت صاف دھو دی گئی تھی، مگر تصویر میں خون کے پوشیدہ نشانات بھی ظاہر ہو گئے،

لیکن جس طرح یہ کیمرا مجرموں کو ماخوذ کرتا ہے، اسی طرح بیگناہوں کو بری بھی کرتا ہے، ایک عورت اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار تھی، عورت کا بیان یہ تھا کہ مقتول شراب پئے ہوئے بدمست گھر آیا، اور پستول نکال کر اسے مار ڈالنے کی دھمکی دینے لگا، یہ اُسے روکنے کی کوشش کرتی رہی اور اس کشمکش میں اتفاقاً گھوڑا دب گیا، اور گولی چل گئی، پولیس کا دعویٰ یہ تھا، کہ شوہر سامنے سے آرہا تھا، کہ عورت نے کمرہ کے جالدار کواڑوں کے پیچھے سے پستول چلا کر اسے مار ڈالا، فیصلہ کا دار و مدار اسی بیان کے ثابت یا رد ہونے پر تھا، مقدمہ کی کارروائی اپنی انتہائی اہمیت پر اس وقت پہنچی

جب ملزمہ کے وکیل نے جیوری کے سامنے تصویروں کا ایک بنڈل پیش کیا، ہر تصویر پستول کی گولی کی تھی، ان میں سے بجز ایک کے تمام گولیوں پر آڑے ترچھے نشانات بنے ہوئے تھے، ان گولیوں کو بار بار تار کے جالدار کواڑ کے اندر سے لکڑی کے تختوں پر چلایا گیا تھا، باوجود اس کے کہ لکڑی انسانی جسم سے کہیں زیادہ سخت چیز ہے، ان گولیوں پر تار کی جالی کے نشانات باقی رہ گئے تھے، لیکن جس گولی سے وہ شخص ہلاک ہوا تھا، اسکی تصویر میں اس قسم کا کوئی نشان موجود نہ تھا، گھنٹوں کی بحث سے بھی جو بات اتنی صفائی سے ثابت نہ ہوتی، وہ ان تصویروں سے ثابت ہو گئی، کہ جس گولی سے ہلاکت واقع ہوئی وہ ہرگز جالی کے کواڑوں کے پیچھے سے چلائی نہیں گئی تھی، اسی ثبوت پر عورت بری کر دی گئی،

مالدیپ کے مسلمان

جزائر مالدیپ برطانیہ کا مقبوضہ ہیں، اور ان کا تعلق حکومت سیلون سے ہے، لیکن اندرونی انتظام خود سلطان اور اسکی حکومت کے ہاتھ میں ہے، سلطان کی مدد کے لئے وزراء کی ایک مجلس اور تین کمیٹیاں ہیں، پہلے ان جزائر کی فرمانروائی اہل چین کو حاصل تھی، اس کے بعد تقریباً سولہ سال تک پرتگال کا قبضہ رہا، پھر برطانیہ کا قبضہ ہوا، اور موجودہ نظام ۱۸۸۷ء کے صلحنامہ کی بناء پر قائم ہے، آبادی تقریباً (۷۹،۰۰۰) ہے، اہل جزائر کا مذہب اسلام ہے، وہ ایک ایسی زبان بولتے ہیں، جو سیلون کی سنہالی زبان سے ملتی جلتی ہے، لیکن ان کے طور طریقے اور رسم و رواج سنہالیوں سے بہت زیادہ مختلف ہیں، متعدد مدرسے ہیں، جن میں بچوں کو فارسی، عربی، اور مالدیپی زبان کی تعلیم دیجاتی ہے، انہی مدرسوں میں جہازرانی کی تعلیم بھی ہوتی ہے،

اہل مالدیپ زیادہ تر ماہی گیر یا کاشتکار ہیں، مالدیپ کی مچھلی ہندوستان کے اکثر حصوں اور سیلون میں بکثرت بھیجی جاتی ہے مچھلی کے بعد تجارت میں ناریل کی رسی کا نمبر ہے، مالدیپ کے ناریل کے درخت کے ریشے جن سے رسی بنائی جاتی ہے، اپنے ہلکے رنگ اور مضبوطی کی وجہ سے صدیوں سے

مشہور ہیں، کہا جاتا ہے، کہ قدیم زمانہ میں اہل پرتگال اپنے جہازوں کے لئے جو بحر ہند میں چلا کرتے تھے، زیادہ تر رسیاں انہی جزیروں سے منگاتے تھے، ان جزیروں کے لوگ اپنے نفیس ملک کے کام اور نہایت باریک چٹائیوں کے لئے بھی مشہور ہیں، یہ لوگ چھوٹے قسم کے ناریل سے ایک طرح کی مٹھائی تیار کرتے ہیں جسکو بونڈی حلوا کہتے ہیں، اس ناریل میں ایک خاص قسم کی خوشبو ہوتی ہے، جو مٹھائی میں بھی سرایت کر جاتی ہے جو سالانہ خراج سیلون بھیجا جاتا ہے، اس میں مذکورہ بالا چیزیں بھی خاص طور پر شامل ہیں، پہلے مالدیپ کے لوگ بنگال سے کوڑیوں کی تجارت بھی بہت کیا کرتے تھے لیکن یہ تجارت اب بہت کم ہو گئی ہے، یہ لوگ تسخیرات اور جادو اور سحر کے لئے بھی مشہور ہیں،

ڈچ ایسٹ انڈیز کے گشتی کتب خانے

ڈچ ایسٹ انڈیز کی حکومت اپنی ساٹھ ملین آبادی کے لئے عام تعلیم کا انتظام کر رہی ہے اور گذشتہ بیس برس میں دو ملین اسکول کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کر چکی ہے، اس سلسلہ میں ایک علمی ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف پاپولر لٹریچر بھی قائم کیا گیا ہے جسکا مقصد یہ ہے کہ مدرسہ کی باضابطہ تعلیم جب ختم ہو جائے اسوقت بھی بے ضابطہ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا جائے، چنانچہ اس ادارہ سے تین ہفتہ وار رسالے شائع ہوتے ہیں، جو حالات حاضرہ پر جاوی، سنڈانی اور ملائی زبان میں تبصرہ کرتے ہیں اور ان تینوں زبانوں میں قصے اور بلند پایہ کتابوں کے ترجمے شائع کرتے رہتے ہیں، اس ادارہ کے ذریعہ سے اسکول لائبریریوں کے علاوہ گشتی کتب خانے بھی قائم کر دیئے گئے ہیں جو خاص قسم کی گاڑیوں میں دیہات دیہات گھومتے پھرتے ہیں، کتابوں کی نمائش کرتے ہیں اور عاریۃً یا بقیمت لوگوں کو کتابیں فراہم کرتے ہیں، ان کتب خانوں کے ذریعہ سے اسوقت تقریباً ڈیڑھ ملین کتابیں گردش میں ہیں اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں صرف جاوا میں (۱۰۰۰) اسکول لائبریریاں تھیں، اور تمام مجمع الجزائر میں (۲۶۳۳)، ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان پڑھنے والوں کی تعداد جاوا میں تقریباً (۱۰۵٬۰۰۰) سے (۳۰۰٬۰۰۰) تک پہونچ گئی، اور تمام جزائر میں (۲۴۰٬۰۰۰) سے تقریباً (۴۰۰٬۰۰۰) تک،

ادبیات

ماتمِ اقبال

از یحییٰ اعظمی

کس کے غم میں وقفِ شیون ہے فضائے باغِ دہر ۔۔۔ خون سے لبریز ہیں کیوں لالہ و گل کے ایاغ

آہ اے اقبال اے مرغِ نوا سنجِ حیات ۔۔۔ ہو گیا محروم نغموں سے ترے مشرق کا باغ

شاعرِ اسلام سے خالی ہوئی بزمِ وجود ۔۔۔ سینۂ ملت نہ کیوں ہو فرطِ غم سے داغ داغ

اُف کہوں کیونکر کہ تیری شمعِ ہستی بجھ گئی ۔۔۔ بجھ گیا صد حیف بزمِ علم و عرفان کا چراغ

تھی تجھی سے ہند میں تندیلِ حکمت ضوفشاں ۔۔۔ اے حکیمِ دیدہ ور اے عارفِ روشن دماغ

تو نے پایا تھا ازل سے سوزِ سلمانؓ و اویسؓ ۔۔۔ تیری بزمِ دل میں روشن تھا محبت کا چراغ

اللہ اللہ یہ جنونِ شوق کی وارفتگی، ۔۔۔ عمر بھر تو نے لگایا کوئے جاناں کا سراغ

ہر نفس تیرا تھا ملت کے لئے یکسر پیام ۔۔۔ تیری ہستی آخری دم تک رہی وقفِ بلاغ

کون اب ہم پر کریگا فاش اسرار و رموز ۔۔۔ فکر کس کا اب لگائے گا حقیقت کا سراغ

تھا جو کل عقدہ کشائے کشمکش گاہِ حیات ۔۔۔ پا گیا اب خود کشاکشہائے ہستی سے فراغ

الوداع اے ملتِ اسلام کے روشن دماغ ۔۔۔ الفراق اے عالمِ توحید کے چشم و چراغ

آہ اب دنیا سے وہ اسرار کا حامل گیا

اس جہانِ آب و گل کا عارفِ کامل گیا

خاکدانِ دہر میں ملتا تجھے کیونکر قرار
خلد میں تھا مرشدِ رومیؒ کو تیرا انتظار

شوق میں تھیں جسکے اک مدت سے آنکھیں فرشِ رہ
آگیا خود آج وہ دیرینہ یارِ غمگسار

رومیؒ و رازیؒ کہیں، سینا و فارابی کہیں
خیر مقدم کو کھڑے ہیں سب قطار اندر قطار

کہہ رہا ہے بے خودی میں شاعرِ المانوی
مرحبا اے ہمدم و ہمرازِ جانِ بیقرار

قدسیانِ پاک میں بھی ہے یہ غوغا چار سو
آگیا ہاں آگیا وہ لامکاں کا رازدار

قدس کی خلوت سرائے راز کا وہ پردہ در
خاکیوں کی فطرتِ بے تاب کا آئینہ دار

آگیا وہ آب و گل کا ترجمانِ خود شناس
ہوشیار اے ساکنانِ عالمِ جاں ہوشیار

آہ اے اقبالؔ اے خاور کی جانِ آرزو
چھوڑ کر مشرق ہوا تو عازمِ دار القرار

بلبلِ مشرق ہوا خاموش اے واحسرتا
کس کے نغمے دیں گے اب ملت کو پیغامِ بہار

برق بن کر دوڑتی تھی جسکی موجِ آتشیں
کیا ہوئی اب وہ نوائے خامۂ معجز نگار

آہ وہ دانائے اسرارِ پیامِ صبح و شام
آہ وہ رمز آشنائے گردشِ لیل و نہار

اب کہاں ہے وہ ادا دانِ مزاجِ کائنات
اب کہاں ہے آہ وہ فطرت شناسِ روزگار

جستجوئے راز میں کل تک تھا وقفِ پیچ و تاب
فکر تیرا آج ہے لطفِ سکوں سے ہمکنار

تو وہاں آسودۂ خلوت سرائے قدس ہے
مشرق و مغرب یہاں ہیں تیرے غم میں سوگوار

تو وہاں سرخوش ہے موجِ کوثر و تسنیم سے
تشنہ کامانِ نگاہِ فیض ہیں یاں بیقرار

دید کے قابل ہے یہ ہنگامۂ آشوبِ غم
ہاں دمے بردار سر اکنوں ز بالینِ مزار

آج ہیں سونے پڑے حکمت کے میخانے تمام،
خوں فشاں ساقی کے غم میں ہیں خم و مینا و جام

اے حیات افروزِ مشرق یہ تری آرامگاہ
اب قیامت تک رہے گی آستانِ مہر و ماہ

لیکے سوغاتیں درودوں کی قطار اندر قطار
نوریانِ عرش اُتریں گے یہاں شام و پگاہ

ہاں رہے گی حشر تک اب مہبطِ انوارِ قدس
عارفِ شوریدۂ اسلام کی یہ خوابگاہ

آسماں اس پر کرے گا گوہرِ انجم نثار
ہونگے ذرہ ذرہ پر اس کے تصدق مہر و ماہ

چپہ چپہ ہوگا، اربابِ نظر کی سجدہ گاہ
ذرہ ذرہ دیدۂ افلاک کا نورِ نگاہ

ہاں بنے گی مرکزِ سیارگانِ علم و فن
آفتابِ جلوہ بارِ شرق کی یہ جلوہ گاہ

تھی پرے کل سرحدِ ادراک سے منزل تری
کیا خبر ہے آج کس عالم میں تیری پائیگاہ

کون جانے جلوہ فرما آج کس محفل میں ہے
"گنبدِ دربستہ" کے آگے تھی کل تک تیری راہ

اب کہاں ہے آہ وہ دیوانۂ بالغ نظر
تھی فروغ انگیزِ مہر و ماہ جس کی گردِ راہ

ہے عرب سے تا عجم غم میں ترے ماتم سرا
اے نوا پیرائے باغِ قدس ادھر بھی اک نگاہ

اب نہ وہ شورِ نوا ہے اور نہ پیغامِ حیات
کیا نہیں؟ اب غم فزا اسلام کا حالِ تباہ

ہے سیہ پوش آج ماتم میں تری اُمت تمام
ہر لبِ مومن پہ جوشِ غم سے ہے فریاد و آہ

اُف مقدر تھا ازل سے یہ غمِ صبر آزما
دیکھنا تھا ایک دن ملت کو یہ روزِ سیاہ

اٹھ گیا دنیا سے وہ شوریدۂ خاکِ حرم،
ہے بجا گر یثرب و بطحا ہوں وقفِ درد و غم

مطبوعات جدیدہ

مکاتیبِ غالب، مرتبہ جناب امتیاز علی صاحب عرشیؔ ناظم کتب خانہ رامپور، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۱۷ صفحے، کاغذ نفیس، ٹائپ پاکیزہ، قیمت مجلد للعہ، پتہ مؤلف سے ملیگی،

مرزا غالب اور دربار رامپور کا تعلق استادی اور شاگردی کا تھا، وہ نواب یوسف علی خان والی رامپور کے استاد تھے، سنہ شاگردی کے بارہ میں مرزا غالب کے بیانات مختلف ہیں، ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۸۵۵ء یا ۱۸۵۷ء میں یہ تعلق قائم ہوا، اور ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا جسے نواب یوسف علی خان کے بعد ان کے جانشین نواب کلب علی خان نے بھی جاری رکھا، اور مرزا غالب کی وفات تک برابر ان کو ملتا رہا، ان کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا، اس حساب سے کم و بیش چودہ پندرہ برس تک دربار رامپور سے وابستہ رہے، اس تعلق سے نواب یوسف علی خان، نواب کلب علی خان اور بعض دوسرے متعلقین ریاست سے مرزا کی خط و کتابت رہتی تھی، ان کے یہ خطوط ریاست کے دار الانشاء میں محفوظ ہیں،

اردو زبان میں مرزا غالب کے خطوط اور ان کے انوکھے طرزِ تحریر کا جس کے وہ موجد بھی تھے اور خاتم بھی ادبی پایہ محتاجِ بیان نہیں، ان کے مکاتیب کو ان کی زندگی ہی میں اتنی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی کہ اسی زمانہ میں اس کے مجموعے شائع ہوئے، اور اس وقت تک اس کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، خطوط تو خطوط، خطوط کے لفافوں تک پر مستقل مضامین لکھے جاتے ہیں، ایسی حالت میں دار الانشاء کے ان ادبی جواہر کو بھی منظر عام پر لانے کی ضرورت تھی، جناب امتیاز علی صاحب عرشی شکریہ کے

مستحق ہیں، کہ انھوں نے یہ اہم ادبی خدمت انجام دی، اور ان خطوط کو ایک بسیط مقدمہ اور نفیس اور ستھری طباعت کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کیا، مقدمہ میں مرزا غالب کے خطوط، اور ان کی تحریروں سے انکے سوانح، تصانیف، تلامذہ، قلعۂ معلّیٰ، اور انگریزوں سے مرزا کے تعلقات کے حالات ہیں، لیکن اسی تخصیص اور اہتمام کے ساتھ مرزا غالب کے حالات لکھے جا چکے ہیں، اس لئے ان حالات میں دربار رامپور سے ان کے تعلق کی تفصیلات کے علاوہ اور کوئی خاص اضافہ نہیں ہے، ذاتی حالات کے بعد مرزا کی انشاء اور خطوط پر تبصرہ اور اس کے جملہ لوازم و متعلقات کے نہایت تفصیلی اور جزوی حالات اور مکاتیبِ غالب کے مجموعوں اور ان کی اشاعت کی تاریخ ہے، یہ حصہ اس کتاب کے مقدمہ کا امتیازی پہلو ہے کہ اس پہلو پر اس استقصاء کے ساتھ کسی نے نہیں لکھا ہے، اس کے بعد خطوط ہیں، ان کی مجموعی تعداد ۱۱۷ ہے، ان میں سے ۴۲ نواب یوسف علی خان کے نام، ۶۵ نواب کلب علی خاں کے نام، صاحبزادہ نواب زین العابدین خان کے نام، منشی سیلچند کے نام اور ایک ایک خلیفہ احمد علی صاحب رامپوری، اور مولوی محمد حسن خان مالک مطبع حسنی کے نام ہیں، ان میں سے چند فارسی میں ہیں، باقی کل اردو میں، یہ خطوط زیادہ تر ذاتی اور خانگی حالات کے متعلق ہیں، ان میں خاص چیز مرزا غالب کی ایک غزل اور کچھ قطعاتِ تاریخ ایسے ہیں، جو ان کے مطبوعہ دواوین میں نہیں ہیں، جو مختلف سلسلوں میں نواب یوسف علی خان اور کلب علی خان کے ملاحظہ کے لئے بھیجے گئے تھے، مؤلف نے اپنے پیشرو مرزا غالب کے سوانح نگاروں کے بعض بیانوں سے ایک دو مقاموں پر اختلاف اور ان کے بعض مسامحات کی تصحیح کی ہے، لیکن ایسے واقعات میں جن کے متعلق کوئی صریح شہادت موجود نہیں ہے، دونوں کے بیانات محض قیاسی ہیں، اسیر لکھنوی سے نواب یوسف علی خان کے تلمذ کے بارہ میں امیر مینائی کے بیان کی تردید نہایت ناکافی ہے، ان مکاتیب میں ایک چیز جس پر ہر پڑھنے والے کی نظر پڑتی ہے وہ مرزا کی پریشان حالی اور افلاس و ناداری کا شکوہ ہے، چونکہ یہ خطوط ان کے آقائے ولی نعمت کے نام ہیں، اس لئے ان میں یہ شے زیادہ نمایاں ہے، بعض خطوط میں تو اپنی تنگدستی اور تباہ حالی کا رونا اس طرح

روئے ہیں، کہ اس کی سرحد دریوزہ گری سے ملجاتی ہے، جو ایک "ترکمان بچہ کے بانکپن سے بہت فروتر ہے"
لیکن یہ ان کے آخری دور کے آلام و مصائب، مالی پریشانیوں، ضعفِ قویٰ اور اس کے دماغی اثرات کا لازمی
نتیجہ ہی ورنہ ان کی فطرت کی بلندی تو یہ تھی،

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا،

اور ایک زمانہ دراز تک وہ اس وضعداری پر قائم رہے، جس پر ان کی زندگی کے متعدد واقعات
شاہد ہیں، ہم نے اس کا ذکر کرنا اس لئے ضروری سمجھا، کہ اس زمانہ کے بعض مصنفین نے غیر اختیاری حوادث
کے نتائج اور اس کے شکوہ کو بھی قابلِ ملامت سمجھا ہے، بہرحال مکاتیبِ غالب کا یہ مجموعہ اردو ادب میں
ایک بیش قیمت اضافہ اور اس کے رتبہ کے مطابق اس کی ظاہری نفاست بھی لائق تعریف ہے، کتاب کی
زینت کے لئے نواب یوسف علی خان، نواب کلب علی خاں اور مرزا غالب کے قلمی مرقعوں کے فوٹو بھی دیئے
گئے ہیں، اور مرزا کے ایک دستی خط کا عکس بھی شامل ہے،

هادی المسترشدین الی اتصال المسندین (عربی) مؤلفہ مولینا ابو سعید محمد عبد الہادی صاحب واعظ سرکار عالی تقطیع بڑی، ضخامت ۶۰۰، ۷ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت اوسط، قیمت اور پتہ مرقوم نہیں،

حدیث نبوی صلعم سے متفرع علوم میں ایک اہم علم "علم الاسناد" ہے، اگرچہ اس کا آغاز روایت
حدیث کے سلسلہ سے ہوا، لیکن پھر تمام علوم پر حاوی ہو گیا، اور جملہ علوم کی تحصیل میں شیوخ اور اسناد
معیار قرار پائے، لیکن مسلمانوں کے پرانے علوم کے انحطاط کے ساتھ اس فن کا بھی مذاق جاتا رہا، اور
آج علماء میں بھی محدثین کے علاوہ اس کے کم قدر دان ملیں گے، ایسے زمانہ میں مولینا عبد الہادی
صاحب کا اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب تالیف کر دینا لائق تحسین ہے، یہ کتاب چار حصوں پر تقسیم
ہے، پہلے حصہ میں مولینا عبد الہادی صاحب نے اپنے ہندوستان اور بیرون ہند کے بعض شیوخ

کے مختصر حالات مع اسناد لکھے ہیں، اور بعضوں کے اجازت ناموں کو بھی نقل کیا ہے، دوسرے حصہ
میں، تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، کلام تصوف اور مختلف علوم و فنون کی ممتاز کتابوں کے اپنے اسناد
کو ان کے مصنفین تک نقل کیا ہے، اور ان کتابوں کی مختصر خصوصیات، ان کے مصنفین کے مختصر حالات
اور ان کی دوسری تصانیف بھی لکھدی ہیں، اس طریقہ سے بہت سے ائمۂ اسلام کے مختصر حالات
جمع ہو گئے ہیں، تیسرے حصہ میں ستر مرفوع احادیث و آثار کو مع ان کے مختلف طرقِ روایت کے
اپنے سے لیکر رسول اللہ صلعم تک پہونچایا ہے، اور ان احادیث سے مستنبط مسائل اور بعض ضروری
فوائد کو بھی لکھدیا ہے، ان احادیث میں یہ امر لائقِ ذکر ہے، کہ ان کے مضامین کی عملی شکل رسول اللہ صلعم
سے لیکر مؤلف تک یکساں ظہور میں آتی چلی آئی ہے، مثلاً تبسم، مصافحہ، اور ضیافت کی احادیث میں
رسول اللہ صلعم سے لیکر مؤلف کے شیخ تک تمام شیوخ نے تلامذہ سے ان احادیث کی روایت کیا تھا
تبسم مصافحہ، اور ضیافت بھی کی، کتاب کے آخر میں مؤلف کے تصوف کے سلاسل ہیں، اس زمانہ میں
اگرچہ کتاب کے قدر دان کم نکلیں گے، لیکن اربابِ علم میں مؤلف کی یہ محنت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائیگی،

جنات الارب، از مولوی نظر احمد صاحب سہسوانی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت مرقوم نہیں، پتہ سید عبد القیوم صاحب آزاد سہسوان قاضی محلہ ضلع بدایوں،

مولینا ضیاء الحسن صاحب علوی ایم اے، رجسٹرار امتحانات، عربی، و فارسی الہ آباد بورڈ نے
"زنات الطرب" کے نام سے نامور شعرائے عرب کے اٹھارہ منتخب قصیدوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، جو غالباً
کسی عربی کے امتحان میں داخل ہے، مولوی نظر احمد صاحب سہسوانی نے طلبہ کی آسانی کے لئے "جنات
الارب" کے نام سے اردو میں اسکی شرح لکھی ہے، ہر قصیدہ کے آغاز میں صاحبِ قصیدہ شاعر کے مختصر
حالات اور اس قصیدہ کی بحر کا ذکر ہے، اشعار کی شرح میں پہلے ہر شعر کے مشکل لغات کا عربی میں

حل ہے، اس کے بعد اردو میں تشریحی ترجمہ ہے، ہم نے جابجا سے اسکو دیکھا ہے، صحیح صاف اور امتحان دینے والے طلبہ کے لئے مفید پایا،

الہامی کلمات، از جناب مولوی جعفر مہدی صاحب نعمانی رزم، ردولوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۸۰ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت معمولی قیمت ۳ر پتہ:۔ مصنف ردولی ضلع بارہ بنکی سے ملیگی،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کلمات طیبات اور مختصر حکیمانہ مقولے پند وموعظت اور حکمت ودانائی کا دفتر ہیں، جناب رزم نے غالباً عبد الواحد آمدی کی غرر الحکم ودرر الکلم سے ان موتیوں کو چنکر ایک سلک مروارید آراستہ کردی ہے، اس مجموعہ میں حضرت علیؓ کے پانسو سرسٹھ حکیمانہ اقوال مع ترجمہ ہیں، آپکے مقولے ارباب محبت کے اوراد ہیں، لیکن آپ کے دیوان اور خطبات کی طرح یہ امر تحقیق طلب ہے کہ آیا یہ تمام مقولے آپ ہی کے ہیں یا آپ کی جانب منسوب ہیں، بہرحال حکمت مومن کا گم گشتہ مال ہے، جہاں ملے اسے حاصل کرنا چاہئے، پھر ارباب محبت کے لئے تو انتساب کافی ہے اس راہ میں تحقیق کا کیا سوال،

مشیت ایزدی اور قرآنی تعلیمات | از جناب محمد یوسف خانصاحب چشتی بریلوی پرنسپل اشاعت اسلام کالج لاہور تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۸ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۵ر پتہ، بیکو آرٹ پریس موچی دروازہ لاہور،

مشیت ایزدی کا مسئلہ اسلام کے پیچیدہ مسائل میں سے ہے، اس مختصر رسالہ میں مولف نے مشیت اور اس سے متفرع مسائل جبر واختیار، خیر وشر، نیکی وبدی، اعمال، جزا وسزا، کا فلسفہ، نظام کائنات، اسکی ترتیب، خدائی مصالح، علل واسباب، خواص اشیاء، وجود باری، توحید باری، اسلام، فلاسفہ، اور دوسری مذاہب کے خدا کے صفات میں فرق اور اس قسم کے مسائل اور سوالات کو جو عموماً دل میں بطور وسوسہ پیدا ہوتے ہیں، آسان طریقہ سے سمجھانیکی کوشش کیگئی ہے، ان مسائل پر نہایت عالمانہ اور تفصیلی مباحث ومضامین موجود ہیں، یہ رسالہ غالباً عوام کیلئے لکھا گیا ہے، اور انکے لئے مفید ہے،

"م"

سیر الصحابہؓ

سیرۃ النبی کے بعد مسلمانوں کیلئے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات مشعل راہ ہو سکتے ہیں، وہ حضرات صحابہ کرام ہیں، دار المصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی وکوشش سے اس عظیم الشان کام کو انجام دیا، اور اردو میں صحابہ کرام کے حالات وسوانح اور اخلاق وحسنات کی دس ضخیم جلدیں احادیث وسیر کے ہزاروں صفحات سے چنکر مرتب کیں، اور بہ حسن وخوبی شائع کیں، ضرورت ہے کہ حق طلب اور ہدایت ورہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفوں کو پڑھیں، اور اس شمع ہدایت کی روشنی میں چلیں، جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدوں کی علٰحدہ علٰحدہ قیمتیں حسب ذیل ہیں، ان کا مجموعہ ؏۲۴ ہوتا ہے لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف ؏۲۰ میں یہ دس جلدیں نذر کیجاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار،

جلد اول	خلفائے راشدینؓ	سے ر	جلد ششم	سیر الصحابہ ششم	عہ ر
جلد دوم	مہاجرینؓ، اول	ہے ر	جلد ہفتم	سیر الصحابہ ہفتم	عہ ر
جلد سوم	مہاجرینؓ دوم	سے ر	جلد ہشتم	سیر الصحابیات	عہ ر
جلد چہارم	سیر الانصارؓ اول	سے ر	جلد نہم	اسوۂ صحابہؓ اول	عہ ر
جلد پنجم	سیر الانصارؓ دوم	عہ ر	جلد دہم	اسوۂ صحابہؓ دوم	ہے ر

منیجر

دار المصنفین اعظم گڈھ